جلد ۸۵ جولائی ۱۹۷۶ء عدد ۵

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

ابوالاعلیٰ مودودی

ادارۂ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

سید ابو الاعلیٰ مودودی

کی

اوّلین تصنیف

الجہاد فی الاسلام

☆ جو ۲۳ سال کی عمر میں تحریر کی گئی۔

☆ جس کی علامہ اقبالؒ نے بھی تعریف وتحسین فرمائی۔

☆ جسے تحریکِ قیامِ پاکستان کے دوران میں مسلمانوں میں جذبۂ جہاد پیدا کرنے کے لیے کثیر تعداد میں پھیلایا گیا۔

☆ اسلام کے نظریۂ جہاد اور قانونِ صلح وجنگ کی بہترین اور مکمل تصویر۔

☆ دیگر مذاہب واقوامِ عالم کے جنگی مقاصد ونظریات۔

اور

☆ بین الاقوامی قوانینِ قتال کا تقابلی مطالعہ۔

☆ اسلامی قواعدِ جہاد کی برتری کے تفصیلی دلائل۔

☆ جہاد کے مخالفین ومعترضین کا مسکت جواب۔

☆ درجنوں کتب ودستاویزات کے مطالعہ کا نچوڑ

چھ سو صفحات — قیمت: ۲۳ روپے

ادارہ ترجمان القرآن - اچھرہ - لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۸۵	جولائی ۱۹۷۶ء مطابق رجب ۱۳۹۶ھ	عدد ۵

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵-اے ذیلدار پارک - اچھرہ - لاہور

فون نمبر:- ۴۱۱۰۱۶ ——— ۴۱۱۰۱۷

زرِ سالانہ بارہ روپے - فی پرچہ ۲۵/۱ روپیہ

ابوالخیر مودودی پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

پرنٹر:- محمد شفیع

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

گذشتہ نصف صدی میں اُمتِ مسلمہ پر بالخصوص دینی نقطۂ نظر سے جو انحطاط آیا ہے اُس کے مُضر اثرات اُس کی قیادت اور سیادت میں بھی بآسانی دیکھے جاسکتے ہیں۔ آج سے تیس چالیس سال بیشتر اِس ملت کی سربراہی کا منصب بالعموم اُن لوگوں کے ہاتھ میں رہا جن کی زندگیاں دیکھ کر اِس امر کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ انہیں اسلام سے گوناگوں تعلقِ خاطر ہے۔ مگر اب چند سالوں سے اِس قوم کی مسندِ قیادت پر وہ لوگ یکے بعد دیگرے براجمان ہو رہے ہیں جو اگرچہ اسلام سے اپنی گہری وابستگی کا اِس کثرت سے اظہار کرتے ہیں کہ اُسے سُن سُن کر لوگوں کے کان پک جاتے ہیں، مگر اُن کی عملی زندگی میں کوئی چیز ایسی نظر نہیں آتی جسے دیکھتے ہوئے یہ کہا جاسکے کہ اُن کی دینِ حق سے فی الحقیقت کوئی شناسائی ہے۔ مسلم قائدین کی نجی اور معاشرتی سرگرمیوں کا قریب قریب وہی انداز ہے جو ہمیں مغربی قیادت کے اندر نظر آتا ہے۔ ماضی میں مسلمان کسی شخص کو سربراہی کا منصب سونپنے سے پہلے یہ دیکھتے تھے کہ وہ ارکانِ اسلام کا کس حد تک پابند اور منکرات سے کس حد تک گریزاں ہے۔ تقوٰی اور پرہیزگاری میں اُس کا کیا مرتبہ اور مقام ہے اور دینی معاملات میں اُس کی سمجھ بوجھ کا کیا عالم ہے۔ لیکن آج مسلم قیادت کا یہ حال ہو گیا ہے کہ جو شخص بھی جھوٹے دعوے کرنے میں جس حد تک جری اور بیباک اور الفاظ کے استعمال میں جس قدر مطلق العنان ہو، اُسی تناسب سے وہ قوم کا محبوب رہنما بنتا ہے۔ قوم اِس بات سے بے نیاز ہو چکی ہے کہ وہ یہ دیکھے کہ جس اسلام کی محبت کا یہ رہنما دعویدار ہے اُس کی کوئی رمق اُس کی زندگی میں بھی نظر آتی ہے یا نہیں۔ اِس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں اسلام کے نام پر اسلام کو مٹانے والی قیادتیں مسلسل اُبھر رہی ہیں۔

اِس بے دین قیادت کے کام کرنے کا ایک ہی اسلوب ہے کہ پہلے مرحلے پر قوم کی معاشی زبوں حالی کا رونا رویا جائے اور بڑی دردمندی کے لہجے میں اُسے یہ باور کرایا جائے کہ یہ دنیا کی دوسری قوموں سے پیچھے رہ گئی ہے لہٰذا اِسے کوئی ایسا فائدہ مند آنا چاہیے جو اسے حالات کے تقاضوں کے مطابق دوسری اقوام کے ہم رکاب کر سکے ۔ لیکن وہ یہ سارا کام اس حکمت اور دانائی کے ساتھ سرانجام دے کہ قوم فکر و عمل کے اعتبار سے اسلام سے دُور بھی ہوتی چلی جائے اور اس کو یہ احساس تک نہ ہونے پائے کہ اسے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت دینِ حق سے بیگانہ بنایا جا رہا ہے اور اگر اُسے اِس مذموم منصوبہ کا شعور ہو بھی جائے تو وہ اسے حالات کا تقاضا سمجھ کر خاموش رہے اور قیادت کو اس معاملہ میں قطعاً مَوردِ الزام نہ ٹھہرائے ۔ اگر آپ اِس بے دین قیادت کے عزائم اور ان عزائم کی تکمیل کے طریقِ کار کو ایک ہی کتاب کے ذریعے سمجھنے کے خواہشمند ہیں تو مرحوم فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کی کتاب " فرینڈز ناٹ ماسٹرز " کا بغور مطالعہ کریں آپ کے سامنے وہ ساری تدابیر آجائیں گی جو مسلمانوں کی جدید قیادت انہیں اسلام سے برگشتہ کرنے کے لیے بالعموم اختیار کرتی ہے ۔ آپ کو اس تصنیف میں مسلمانوں کی معاشی بدحالی کا تذکرہ بھی ملے گا ، حالات کی سنگینی پر بھی زوردار مباحث نظر آئیں گے اور اسلام کو جدید سانچوں میں ڈھالنے کے لیے متعدد تجاویز بھی آپ کی نگاہ سے گذریں گی ۔ اِس پوری کتاب کے مندرجات کا اگر دقتِ نظر سے مطالعہ کیا جائے تو ایک قاری کے لیے اُن رہنما اُصولوں کو جاننا کچھ مشکل نہیں ہوتا جن کے مطابق مغربی تہذیب کے دلدادہ مسلمان قائدین عمل کر رہے ہیں ۔ بس ایک مرتبہ مسلم معاشرے کے ذہن میں یہ باطل خیال بٹھا دیجیے کہ اُن کے مرض کا اصل علاج یہ ہے کہ انہیں حالات کے تقاضوں سے ہم آہنگ کر دیا جائے تو پھر اسلام کے خلاف بغاوت کی کوئی مہم شروع کیے بغیر قوم اسلام سے خود بخود بے تعلق ہو جائے گی ۔

یہ صورتِ حال پھر اُمتِ مُسلمہ کے ساتھ ہی مخصوص نہیں بلکہ آج تک دنیا میں جتنی قومیں بھی حق و صداقت کے راستے سے بھٹکی ہیں انہیں حالات کے تقاضوں نے ہی گمراہ کیا ہے ۔ یورپ میں جب صنعتی انقلاب آیا اور جاندار مخلوق کے مقابلے میں بے جان مشینوں کی قدر و قیمت بڑھنے لگی اور ایسے مزدوروں کی ضرورت لاحق ہوئی جو کم سے کم معاوضہ قبول کر کے زیادہ سے زیادہ کام کر سکیں تو ان نئے تقاضوں کے تحت ہی سود کا انتہائی ظالمانہ نظام قائم کیا ۔ اور عورت گھر کی چار دیواری سے نکل کر کارخانوں میں مردوں کے

دوش بدوش کام کرنے پر مجبور ہوئی اور اس طرح خاندانی نظام تہ و بالا ہو کر رہ گیا۔ اگر کوئی شخص حالات کے ان بے رحم تقاضوں کی تباہ کاریوں کا اندازہ کرنا چاہتا ہے تو اسے (TAWNEY) کی مشہور کتاب "مذہب اور سرمایہ داری کا فروغ" (RELIGION AND THE RISE OF CAPITALISM) کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ اسے دیکھنے سے اس کے سامنے یہ اندوہناک حقیقت پوری طرح منکشف ہو جائے گی کہ کس طرح مغرب کے صنعتی اور معاشی تقاضوں نے "حالات کے تقاضوں" کا روپ دھار کر حضرت مسیح علیہ السلام کے پرستاروں کو اس بات پر آمادہ کر دیا کہ وہ مذہب کی مقدس قبا چاک کر کے اپنے آپ کو اخلاقی اور روحانی اقدار سے یکسر عاری کر لیں اور وقتی تقاضوں کی بارگاہ میں صمیم قلب سے سجدہ ریز ہوتے ہوئے ہر اس کام کو سرانجام دینے کے لیے کمر بستہ ہو جائیں، جن کا وقت مطالبہ کرتا ہے۔ اگر وقت حلال و حرام کے امتیازات کو مٹانے کی طرف اشارہ کرے تو لوگ انہیں پورے جذبۂ اطاعت گذاری کے ساتھ اپنے دل و دماغ سے محو کر دیں اور اگر حالات کے تیور دیکھنے سے یہ معلوم ہو کہ یہ فحاشی اور بے حیائی کے لیے سازگار ہیں تو پھر منکرات کو ایک فرض کی حیثیت سے پھیلایا جائے۔

بات ذرا طویل ہوتی جا رہی ہے، مگر اہل یورپ کا مذہب سے ایک تدریج کے ساتھ انحراف کا مطالعہ اسلام کے خادموں کے لیے بے حد ضروری ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ماضی میں بھی لوگ مذہبی بندھنوں کو توڑتے رہے ہیں لیکن ماضی اور حال کے مذہب گریز رجحانات کے مابین ایک نمایاں فرق ہے۔ ماضی میں جب کوئی فرد یا گروہ مذہب سے بغاوت کرتا تھا تو وہ یہ غلط روش یا تو اپنے سفلی جذبات کی تسکین کی خاطر یا مادی مفادات کے حصول کے لیے اختیار کرتا تھا۔ لیکن مذہب کے خلاف جدید انسان کی بغاوت کا انداز ماضی کے مقابلہ میں یکسر جداگانہ ہے۔ آج کوئی شخص یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتا کہ مذہب کے بندھن اس کے لیے ناروا بوجھ ہیں یا وہ مذہب کی اخلاقی اور روحانی اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتا کیونکہ اگر وہ اس حقیقت کو تسلیم کر لے تو یہ اس کے لیے اعترافِ شکست کے مترادف ہے اور آج کا انسان اس اعتراف کے لیے کبھی تیار نہیں ہو سکتا۔ اس لیے اس نے عوام کو مذہب سے برگشتہ کرنے کے لیے حالات کے تقاضوں کا سہارا لیا ہے اور کچھ اس انداز سے انہیں راہ راست سے بھٹکانے کی کوشش کی ہے کہ مذہب اس دور کی ایک فطری ضرورت تھی جس دور میں اس نے جنم لیا۔ لیکن اب دنیا کے تقاضے

بدل گئے ہیں، لہٰذا کوئی "قدیم مذہب" اِس جدید دَور میں "نئے انسان" کی رہنمائی نہیں کرسکتا اور اس باطل خیال کو صحیح ثابت کرنے کے لیے عموماً یہ مثال دی جاتی ہے کہ آخر وہ لباس جو ایک شخص اپنے عہدِ طفولیت میں پہنتا تھا وہ اُس کے جوان ہونے کے بعد اُس کے جسم پر کس طرح راست آسکتا ہے؟ اور اگر اسے کوئی فرد یا گروہ راست کرنے کی کوشش کرتا ہے تو کیا اس کی یہ حرکت دیوانگی سے کم ہے۔ اپنے اس نظریہ کی تائید میں یہ لوگ چند شواہد بھی فراہم کردیتے ہیں جو بہر طور دورِ جدید کے معاشی حالات کی کوکھ ہی سے نکلے ہیں۔ مثلاً یہ صنعتی ترقی کے بارے میں ایک استدلال پیش کریں گے کہ اگر سودی کاروبار ختم ہو جائے تو سرمایہ کس طرح فراہم ہوگا اور اگر عورتیں گھر کی چار دیواری میں مقید کردی جائیں تو کام کرنے والے ہاتھ کہاں سے آئیں گے اور اگر ضبطِ تولید سے کام لیتے ہوئے افزائشِ نسل پر پابندی عائد نہ کی جائے تو عوام کا معیارِ زندگی کس طرح بلند ہوگا اور اب اشتراکیت کے فروغ کے بعد یہ بات بھی کہی جانے لگی ہے کہ اگر ملک کے وسائل حکومت کی تحویل میں نہ دیے جائیں تو استحصال کا خاتمہ کس طرح ممکن ہوگا! مذہب دشمن عناصر یہ غلط استدلال اس زوردار طریق سے سامنے لاتے ہیں کہ سننے والا اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ وہ جو کچھ بیان کررہے ہیں گویا وہ فطرت کے ناقابلِ تغیر اصول یا ٹھوس منطقی حقائق ہیں جنہیں جھٹلایا نہیں جاسکتا۔ چنانچہ وہ ایک طرف تو انہیں سو فیصد درست تسلیم کرتے ہیں اور دوسری طرف اپنے مذہب، اس کے معتقدات اور اُس کی تعلیمات کا جائزہ لے کر یہ دیکھتے ہیں کہ وقتی تقاضوں اور دینی مطالبات میں کہاں تک مطابقت پیدا ہوسکتی ہے اور جب اُن میں بُعد و بیگانگی محسوس کرتے ہیں تو کچھ مدت کے لیے اُن کے درمیان بالکل مصنوعی بلکہ غیر عاقلانہ فکری اور عملی تدابیر کے ذریعے مصالحت کرانے کی کوشش کرتے ہیں، مگر جلد ہی انہیں اِس بات کا احساس ہو جاتا ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ وقتی تقاضے مذہبی تعلیمات سے ہر صورت میں ہم آہنگ ہی ہوں، بلکہ بسا اوقات ان کے درمیان اختلاف کی نہایت ہی وسیع خلیج حائل ہو جاتی ہے جسے سطحی اور احمقانہ فلسفوں سے پاٹا نہیں جاسکتا۔ اور ایک دیانتدار شخص اس بات پر مجبور ہو جاتا ہے کہ وہ یا تو مذہب کو تیاگ دے یا وقتی تقاضوں کے تحت حاصل ہونے والی مراعات سے اپنے آپ کو محروم کرلے۔

وقتی تقاضوں کے پرستار پہلے مرحلے پر دینِ حق کے خلاف کوئی لفظ کھل کر زبان پر نہیں لاتے

بلکہ مذہب کے رُوحانی عنصر کی تعریف ہی کرتے ہیں اور اس نسبت سے وہ اُن بزرگوں کی عزت و احترام کا بھی ڈھونگ رچاتے ہیں جن کے بارے میں مسلمانوں کے اندر یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ وہ شریعت کی پابندیوں سے بے نیاز تھے۔ ان ملحدین کا سارا زور صرف اس بات پر صرف ہوتا ہے کہ دینی تعلیمات خصوصاً مطالباتِ شریعت اور " وقتی تقاضوں" کے درمیان اختلافات زیادہ سے زیادہ نمایاں ہوں بلکہ اُن کے مابین شدید نوعیت کی آویزش جنم لے اور لوگوں کے اندر یہ احساس پیدا ہونے لگے کہ مذہب اُن کی تغیر پذیر زندگی کی ہر آن بڑھتی ہوئی ضروریات کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ اس لیے یا تو اُسے بالکل مسترد کر دیا جائے یا اُسے اجتماعی زندگی کے دائرہ سے نکال کر ذاتی زندگی تک محدود کر دیا جائے۔ چنانچہ پہلے مرحلہ میں ملحدانہ تحریکیں انسان کو مذہب سے متنفر نہیں کرتیں بلکہ اُسے اس امر کی تلقین کرتی ہیں کہ وہ اپنے آپ کو یہ حقیقت تسلیم کرنے پر آمادہ کر لیں کہ " فرسودہ مذہب" دورِ جدید کے اجتماعی تقاضوں کو پورا کرنے سے عاجز ہے۔ اِس بنا پر اجتماعی زندگی کے نظم و نسق کے لیے یہ ضروری ہے کہ اہل مذہب ایسے اصول اور ضابطے وضع کرنے کی اجازت دے دیں جو شریعت سے خواہ متصادم ہی ہوں مگر قوم کے لیے مفید اور کار آمد ہوں ۔ چنانچہ مذہب کے باغی اس مرحلہ پر بھی بڑی عیاری کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اُن کے ہاتھوں دینی تعلیمات کا حلیہ بگڑتا ہے مگر سادہ لوح عوام کو یہی تاثر دیا جاتا ہے کہ فلاحِ ملّت کی خاطر جو کچھ کیا جا رہا ہے وہ دینی تقاضا ہی ہے۔ بعض سطح بین، شر پسند اور تنگ نظر افراد خصوصاً " ملّا" اگرچہ ان کی اِن ملّی خدمات کو دینی مستحبات کے خلاف ہی سمجھتے ہیں لیکن حقیقت میں اُن کی اِن کوششوں سے دین کا حقیقی منشا پورا ہو رہا ہے۔ مثال کے طور پر وہ اپنی ہوسناکی کی تسکین کی خاطر عورت کو گھر کی چاردیواری سے نکال کر شمعِ انجمن بنانے کے درپے ہوتے ہیں اور اُسے آرٹ اور کلچر کے نام پر گمراہ کرنے کی مختلف چالیں چلتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ سارا کام عورت کی آزادی اور اس کے استحصال کے خاتمہ کے نام پر کیا جاتا ہے اور اپنی فریب کاریوں پر پردہ ڈالنے اور اپنی مذموم کوششوں کو مقدس بنانے کی غرض سے قرآن مجید کی ان آیات کا حوالہ تو دیا جاتا ہے جن میں عورت کے بلند مرتبہ و مقام کا تذکرہ موجود ہے مگر وہ آیات ان کی نظروں سے ہمیشہ اوجھل رہتی ہیں جن میں صنفِ نازک کو وقار کے ساتھ اپنے گھروں میں بیٹھنے کا حکم دیا گیا ہے۔

اسی طرح اللہ کے دین کو مسخ کرنے والے ان جدید مفکرین کو یہ بات تو یاد ہے کہ دینِ حق انسان کی اجتماعی زندگی کو عدل و انصاف کی بنیادوں پر استوار کرتا ہے، لیکن اس کے ہاں اجتماعی عدل کا جو مخصوص تصور ہے اور اس مقصد کے حصول کے لیے وہ جن تدابیر کو اختیار کرنے کی تعلیم دیتا ہے، اُن سے ان حضرات کو کوئی سروکار نہیں۔ چنانچہ اجتماعی عدل کے نام پر یہ لوگ مسلم قوم پر اشتراکیت جیسا انسانیت سوز اور جابرانہ نظام مسلط کر دیتے ہیں اور یہ سارے مراحل اس طرح طے کیے جاتے ہیں کہ عام لوگوں کو اس بات کا شعور نہیں ہوتا کہ اجتماعی انصاف کے پردہ میں انہیں کس عذاب کی طرف دھکیلا جا رہا ہے۔ بظاہر سارا زور اجتماعی عدل کی ضرورت اور اسلام میں اُس کی غیر معمولی اہمیت پر دیا جاتا ہے۔ آخر اس پروپگنڈا کے سامنے کون یہ بات کہنے کی جسارت کر سکتا ہے کہ اُسے اجتماعی عدل عزیز نہیں بلکہ اجتماعی ناانصافی مطلوب ہے۔

جب کوئی دینی مزاج کا حامل معاشرہ "اجتماعی عدل" پر پوری طرح ایمان لے آتا ہے اور اُسے اپنی زندگی کی غایت اولیٰ قرار دے دیتا ہے تو پھر اس کے کان میں یہ بات پھونکی جاتی ہے کہ اگر ملک کے سارے ذرائع پیداوار مکمل طور پر حکومت کے قبضے میں نہ ہوں تو وہاں معاشی عدل کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ فکر و نظر کی اس تبدیلی سے نہ صرف اخلاقی اقدار بدلتی ہیں بلکہ جذبات کی دُنیا میں بھی غیر معمولی تغیر رُونما ہوتا ہے۔ اس نصب العین کے حصول کی خاطر معاشرہ نہایت ہی ظالمانہ نوعیت کی جکڑ بندیاں قبول کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ وہ آزادی کی جگہ مسلکِ غلامی اختیار کرتا ہے اور اشیاء اور اعمال کی قدر و قیمت رُوحانی معیار سے جانچنے کے بجائے مادّی نقطۂ نظر سے متعین کرتا ہے جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ کسی غیر معمولی خارجی دباؤ کے بغیر الحاد و دہریت کی آغوش میں چلا جاتا ہے۔ اس المناک تبدیلی کے آغاز میں تو اُس کے اندر "مذہبی حس" ایک مدھم سی لَو کی طرح موجود رہتی ہے۔ لیکن جوں جوں وہ اجتماعیت کے دامِ فریب میں گرفتار ہونے کی وجہ سے الحاد کی طرف بڑھتا ہے تو یہ لَو بھی گورِ غریباں کے افسردہ چراغوں کی طرح جلد گل ہو جاتی ہے۔ قلب و نگاہ کی دُنیا تو اندھیر ہوتی ہی ہے، معیشت، معاشرت اور سیاست پر بھی الحاد کے تاریک سایے چھا جاتے ہیں اور انسان ایک ایسا حیوان بن جاتا ہے جس کی زندگی کا مقصد بجز اس کے اور کوئی نہیں ہوتا کہ چوپایوں کی طرح ہر قسم کے اخلاقی احساسات سے عاری ہو کر مملکت کی چاکری کرے اور اس کے عوض نپا تلا چارہ حاصل کرکے

جسم و جان کے رشتے کو برقرار رکھنے کی کوشش کرے۔

ایک ہوشمند انسان جب اس عذاب میں مبتلا ہوجاتا ہے تو پھر وہ یہ سوچتا ہے کہ اُسے تو اجتماعی عدل درکار تھا آخر اس کے حصے میں بھیانک قسم کی غلامی کیوں آئی ہے! عام حالات میں بھی جب سپنوں کے محل ٹوٹتے ہیں تو انسان کو اچھی خاصی اذیت ہوتی ہے لیکن سپنوں کے وہ محلات جن کے لیے انسان نے جسم و جان کی ساری قوتیں کھپادی ہوں جب زمین بوس ہوکر انسان کو سنگین حقائق سے دوچار کرتے ہیں تو اُس کی زندگی ایک دردناک تجزیہ بن جاتی ہے۔ یہی حال عدلِ اجتماعی کے اُن فریب خوردہ طلب گاروں کا ہوتا ہے۔ وہ اپنی ناکامیوں اور نامرادیوں پر افسردہ خاطر ہوکر غور کرتے ہیں لیکن غور و فکر کے باوجود اس حقیقت کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں کہ ان کی ناکامی کی اصل وجہ خارجی حالات نہیں بلکہ اُن کی اپنی نادانی ہے۔ انہوں نے حماقت سے یہ باطل خیال اپنے ذہن میں بٹھا رکھا ہے کہ جن باتوں کو اُن کے دشمن حالات کے تقاضوں سے تعبیر کرتے ہیں وہ درحقیقت زندگی کے ایسے ٹھوس مسائل ہیں جن کا حل اُسی انداز میں ممکن ہے جس کی نشاندہی اعدائے دین کر رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان لوگوں کی فریب کاریوں سے مسلمانوں کی قوتِ فکر و عمل اس حد تک مفلوج ہوکر رہ گئی ہے کہ وہ کسی غلط مقصد کے حصول کی خاطر طفلانہ اور غیر عاقلانہ تدابیر کو ہی زندگی کے ٹھوس حقائق سمجھ بیٹھے ہیں۔

اہلِ مغرب کی اس عیاری اور مسلمانوں کی اس ابلہ فریبی کی متعدد مثالیں مشہور مغربی مورخ ٹائن بی (TOYNBEE) کی شہرہ آفاق کتاب "مطالعۂ تاریخ" میں بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔ تاریخ کا یہ عالم گذرے ہوئے حالات اور واقعات کا مطالعہ کرتے ہوئے اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ پوری انسانی تاریخ تحدّی (CHALLENGE) اور معاکسۂ عمل (RESPONSE) کی کرشمہ سازی ہے۔ حالات کسی قوم کے سامنے چند نہایت ہی پیچیدہ نوعیت کے مسائل پیش کرتے ہیں جو اُس کے لیے چیلنج کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ قوم جو اس چیلنج کو قبول کرتے ہوئے فکر و عمل کو بروئے کار لاتی ہے وہ اگر انہیں حل کرنے میں کامیاب ہوجائے تو دنیا میں سربلند ہوتی ہے اور ناکامی کی صورت میں (باقی برصفحہ ۴۶

ہجرتِ حبشہ

(۳)

دوسری ہجرتِ حبشہ

جب مکہ میں ظلم شدید سے شدید تر ہوتا چلا گیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ حبش مسلمانوں کے لیے امن کی جگہ ثابت ہوا ہے، تو آپ نے پھر ہدایت فرمائی کہ یہ مظلوم لوگ حبش ہی کی طرف ہجرت کر جائیں۔ چنانچہ سنہ ۶ بعد بعثت کے آغاز (سنہ ۶۱۵ء) میں دوسری ہجرت واقع ہوئی۔ اگرچہ قریش نے اس ہجرت کو روکنے کی پوری کوشش کی، نکلنے والوں کو بہت تنگ کیا اور ان کے راستے میں سخت مشکلات پیدا کیں، لیکن اس کے باوجود اس موقع پر ۸۰ سے زیادہ مردوں اور ۱۸-۱۹ عورتوں نے حبش کی راہ لی اور وہاں یہ لوگ بخیریت پہنچ گئے۔ ابن سعد نے مردوں کی تعداد ۸۳ بیان کی ہے، اور عورتوں میں ۱۱ قریشی اور سات غیر قریشی خواتین کا ذکر کیا ہے۔ ۸۳ مردوں میں حضرت عمارؓ بن یاسر کا نام لیا گیا ہے، مگر ابن اسحاق نے ان کے شریک ہونے میں شک کیا ہے اور واقدی اور ابن عُقبہ وغیرہ نے یقین کے ساتھ کہا ہے کہ وہ اُن میں شامل نہ تھے۔ اسی طرح ان مہاجرین میں حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کا نام بھی لیا گیا ہے، لیکن صحیح یہ ہے کہ انہوں نے مکہ سے ہجرت نہیں کی تھی بلکہ پہلے وہ مکہ میں آکر مسلمان ہوئے، پھر یمن واپس جاکر اسلام کی اشاعت کی، اس کے بعد اپنی قوم کے کچھ لوگوں کے ساتھ (جن کی تعداد ۵۲، ۵۳ بتائی جاتی ہے) ایک کشتی میں یمن سے روانہ ہوئے، مگر ہواؤں نے ان کی کشتی کو حبش کے ساحل پر لا ڈالا، اس طرح وہ مہاجرینِ حبشہ سے جا ملے۔ صحیحین میں خود حضرت ابو موسیٰؓ کی اپنی روایت بھی ہے اور اس میں وہ فرماتے ہیں کہ ہمیں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلانِ نبوت کی خبر ملی اور ہم یمن میں تھے، تو ہم کشتی میں روانہ ہوئے، مگر ہماری کشتی نے ہمیں حبشہ پہنچا دیا اور وہاں ہم جعفرؓ بن ابی طالب کے ساتھ مل گئے، پھر فتح خیبر کے موقع پر اُن کے ساتھ خیبر پہنچے۔ ابن سعدؒ نے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کا قول نقل کیا ہے کہ ہم یمن سے اپنی قوم کے پچاس سے زائد آدمیوں کے ساتھ نکلے اور کشتی میں

ہمیں نجاشی کے علاقے میں پہنچا دیا جہاں جعفرؓ بن ابی طالب پہلے سے موجود تھے۔

مہاجرین کی فہرست اس ہجرت کی اہمیت کا پورا اندازہ مہاجرین کی اس فہرست سے ہوتا ہے جو ابن ہشام نے سیرت میں ابن اسحاق کے حوالہ سے درج کی ہے:-

بنی ہاشم میں سے
۱- جعفرؓ بن ابی طالب
۲- ان کی بیوی اسماءؓ بنت عُمَیس خَثْعَمِیَّہ۔

بنی امیہ میں سے
۳- عثمانؓ بن عفان
۴- ان کی بیوی رقیہؓ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
۵- عمروؓ بن سعید بن العاص (ان کے باپ سعید بن العاص کی کنیت ابواُحَیحَہ تھی)۔
۶- اُن کی بیوی فاطمہؓ بنت صَفوان (یہ بنی کنانہ میں سے تھیں)۔
۷- اُن کے بھائی خالدؓ بن سعید بن العاص۔
۸- اُن کی بیوی اُمَینہؓ بنت خَلَف (بعض لوگوں نے ان کا نام ہُمَینہ لکھا ہے۔ یہ بنی خُزاعہ میں سے تھیں)۔

حُلفائے بنی اُمیہ میں سے
۹- عبداللہؓ بن جَحش (یہ بنی غَنْم بن دُودان میں سے تھے اور ام المومنین حضرت زینبؓ کے بھائی تھے)۔
۱۰- ان کا بھائی عبیداللہ بن جَحش (یہ شخص حبش میں عیسائی ہو کر مرا)۔
۱۱- اُس کی بیوی اُم حَبِیبہؓ (یہ ابوسفیان کی بیٹی تھیں۔ حبش ہی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ نے نجاشی کے توسط سے ان کو اپنی زوجیت میں لے لیا)۔
۱۲- قیسؓ بن عبداللہ (یہ بنی اسد بن خُزَیمہ میں سے تھے)۔
۱۳- ان کی بیوی بَرَکہؓ بنت یَسار (ابوسفیان کی آزاد کردہ لونڈی)۔
۱۴- مُعَیقیبؓ بن ابی فاطمہ (یہ قبیلہ دَوس میں سے تھے)۔

بنی عبدشمس بن عبد مَناف میں سے ۱۵- ابو حُذَیفہؓ بن عُتبہ بن رَبیعہ۔

حُلفائے بنی نوفل بن عبد مَناف میں سے ۱۶- عُتبہؓ بن غَزوان (یہ بنی قیس بن عَیلان میں سے تھے)۔

بنی اسد بن عبد العزّیٰ بن قصیّ میں سے — ۱۷۔ زُبیرؓ بن العوّام بن خُوَیلد } یہ دونوں حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے تھے

۱۸۔ اَسوَدؓ بن نوفل بن خُوَیلد۔

۱۹۔ یزیدؓ بن زَمعہ بن اَسود بن مُطّلب۔

۲۰۔ عَمروؓ بن اُمیّہ بن حارث بن اَسَد۔

بنی عبد بن قُصیّ میں سے — ۲۱۔ طُلَیبؓ بن عُمَیر بن وَہب۔ (یہ حضورؐ کی پھوپھی اَروٰی بنت عبدالمطلب کے صاحبزادے تھے)۔

بنی عبد الدار بن قُصیّ میں سے — ۲۲۔ مُصعَبؓ بن عُمَیر بن ہاشم۔

۲۳۔ سُوَیبطؓ بن سعد۔

۲۴۔ جَہمؓ بن قیس

۲۵۔ اُن کی بیوی امِ حَرمَلہؓ بنت عبدالاسود (یہ بنی خُزاعہ میں سے تھیں)۔

۲۶۔ ان کے بیٹے عَمروؓ بن جَہم۔

۲۷۔ ان کے دوسرے بیٹے خُزَیمہؓ بن جَہم۔

۲۸۔ ابوالرّومؓ بن عُمَیر بن ہاشم (حضرت مُصعبؓ بن عمیر کے بھائی)۔

۲۹۔ فِراسؓ بن نَضر بن حارث بن کَلَدہ (یہ اُسی شخص کے بیٹے تھے جس نے اسلام کو زک دینے کے لیے ثقافتی پروگرام شروع کیا تھا)۔

بنی زُہرہ میں سے — ۳۰۔ عبدالرحمٰنؓ بن عَوف

۳۱۔ عامرؓ بن ابی وَقّاص (حضرت سعدؓ بن ابی وَقّاص کے بھائی)۔

۳۲۔ مُطّلبؓ بن اَزہَر۔

۳۳۔ اُن کی بیوی رَملہؓ بنت ابی عَوف (یہ بنی سَہم میں سے تھیں)۔

حُلفائے بنی زہرہ میں سے — ۳۴۔ عبداللہؓ بن مسعود (یہ قبیلہ ہُذَیل میں سے تھے)۔

۳۵۔ اُن کے بھائی عُتبہؓ بن مسعود۔

۳۶۔ مِقدادؓ بن عَمرو (یہ مقداد بن اَسوَد کہلاتے تھے کیونکہ اَسوَد بن عبد یَغُوث نے اُن کو بیٹا بنا لیا تھا)۔

بنی تیم میں سے

۳۷ - حارثؓ بن خالد - (یہ حضرت ابوبکرؓ کے ماموں زاد بھائی تھے)۔

۳۸ - ان کی بیوی رَیطہؓ بنت الحارث بن جَبَلہ یا جُبَیلہ (یہ بھی بنی تیم میں سے تھیں)۔

۳۹ - عَمروؓ بن عثمان - (یہ حضرت طلحہؓ کے چچا تھے)۔

بنی مخزوم میں سے

۴۰ - ابوسلمہؓ بن عبدالاسد - (حضورؐ کے دودھ شریک اور پھوپھی زاد بھائی)۔

۴۱ - ان کی بیوی اُمّ سلمہؓ - (یہ بھی بنی مخزوم میں سے تھیں اور بعد میں ان کو ام المومنین ہونے کا شرف نصیب ہوا)۔

۴۲ - شَمّاسؓ بن عثمان (یہ عُتبہ بن ربیعہ کے بھانجے تھے)۔

۴۳ - ہَبّارؓ بن سفیان -

۴۴ - ان کے بھائی عبداللہؓ بن سفیان - (بعض لوگوں نے ان کا نام عبیداللہ لکھا ہے)۔

۴۵ - ہشامؓ بن ابی حُذیفہ بن مُغیرہ - (بعض لوگوں نے ان کا نام ہاشم لکھا ہے)۔

۴۶ - سَلمہؓ بن ہشام بن مُغیرہ - (ابوجہل کے بھائی)۔

۴۷ - عَیّاشؓ بن ابی رَبیعہ - (ابوجہل کے بھائی)۔

حلفائے بنی مخزوم میں سے

۴۸ - مُعَتِّبؓ بن عوف - (یہ بنی خُزاعہ میں سے تھے)۔

بنی جُمَح میں سے

۴۹ - عثمانؓ بن مَظعون - (حضرت عمرؓ کے برادر نسبتی اور حضرت حفصہؓ کے ماموں)۔

۵۰ - ان کے بیٹے سائبؓ بن عثمان -

۵۱ - ان کے بھائی قُدامہؓ بن مظعون -

۵۲ - ان کے دوسرے بھائی عبداللہؓ بن مظعون -

۵۳ - حاطبؓ بن الحارث -

۵۴ - ان کی بیوی فاطمہؓ بنت مُجَلِّل عامریہ -

۵۵ - ان کے بیٹے محمدؓ بن حاطب -

۵۶- ان کے دوسرے بیٹے حارثؓ بن حاطب۔
۵۷- ان کے بھائی حطابؓ بن الحارث۔
۵۸- ان کی بیوی فُکَیہہؓ بنت یسار۔
۵۹- سُفیانؓ بن مَعمَر۔
۶۰- ان کے بیٹے جابرؓ بن سفیان۔
۶۱- ان کے دوسرے بیٹے جُنادہؓ بن سفیان۔
۶۲- ان کی بیوی حَسَنہؓ۔ (جابر و جُنادہ کی ماں)۔
۶۳- حَسَنہؓ کے پہلے شوہر سے بیٹے شُرَحبِیلؓ بن حَسَنہ (یہ بنی غوث بن مُر میں سے تھے)۔
۶۴- عثمانؓ رَبیعہ بن اُہبان۔

بنی سَہم میں سے

۶۵- خُنَیسؓ بن حُذافہ۔ (حضرت عمرؓ کے داماد - حضرت حفصہؓ ام المومنین کے پہلے شوہر)۔
۶۶- عبداللہؓ بن حارث۔
۶۷- ہشامؓ بن عاص بن وائل۔ (عَمرو بن العاص کے بھائی)۔
۶۸- قیسؓ بن حُذافہ۔
۶۹- ابوقیسؓ بن حارث
۷۰- عبداللہؓ بن حُذافہ
۷۱- حارثؓ بن حارث بن قیس
۷۲- مَعمَرؓ بن حارث بن قیس
۷۳- بِشرؓ بن حارث بن قیس
۷۴- ان کے ماں جائے بھائی سعیدؓ بن عَمرو (یہ بنی تمیم میں سے تھے)۔
۷۵- سعیدؓ بن حارث بن قیس۔
۷۶- سائبؓ بن حارث بن قیس۔

۷۷ - عُمیرؓ بن رِئاب -

حلفائے بنی سہم میں سے — ۷۸ - مَحمِیَّہؓ بن الجزء (یہ بنی زُبید میں سے تھے)۔

بنی عَدِی میں سے — ۷۹ - مَعمرؓ بن عبداللہ بن نَضلَہ -

۸۰ - عُروہؓ بن عبدالعزّیٰ - (بعض لوگوں نے عروہ بن ابی اثاثہ بن عبدالعزّیٰ لکھا ہے) -

۸۱ - عَدِیؓ بن نَضلَہ -

۸۲ - ان کے بیٹے نُعمانؓ بن عَدِی -

حلفائے بنی عَدِی میں سے — ۸۳ - عامرؓ بن ربیعۃ العنزی (بنی عَنز بن وائل میں سے تھے اور حضرت عمرؓ کے باپ خطّاب نے ان کو بیٹا بنا رکھا تھا) -

۸۴ - ان کی بیوی لیلیٰؓ بنت ابی حَثمہ (یہ بنی عَدِی میں سے تھیں) -

بنی عامر بن لُؤَیّ میں سے — ۸۵ - ابو سَبرہؓ بن ابی رُہم - (یہ حضورؐ کی پھوپھی بَرّہ بنت عبدالمطلب کے بیٹے تھے)

۸۶ - ان کی بیوی امّ کلثومؓ بنت سُہیل بن عَمرو -

۸۷ - عبداللہؓ بن مَخرَمَہ -

۸۸ - عبداللہؓ بن سُہیل بن عمرو -

۸۹ - سَلیطؓ بن عمرو -

۹۰ - ان کے بھائی سَکرانؓ بن عمرو -

۹۱ - ان کی بیوی سَودہؓ بنت زَمعَہ (جنہیں بعد میں امّ المومنین بننے کا شرف حاصل ہوا)۔

۹۲ - مالکؓ بن زَمعَہ (حضرت سَودہؓ کے بھائی) -

۹۳ - ان کی بیوی عَمرہؓ بنت السّعدی - (بعض لوگوں نے ان کا نام عُمَیرہ لکھا ہے)۔

۹۴ - حاطبؓ (یا ابو حاطب) بن عمرو -

حُلَفائے بنی عامر میں سے ۹۵ - سعدؓ بن خَوْلَہ یا خَوْلَہ - (یہ یمنی تھے) -

بنی الحارث بن فِہر میں سے ۹۶ - ابوعبیدہؓ بن الجرّاح -

۹۷ - سُہَیلؓ بن بیضاء -

۹۸ - عمروؓ ابن ابی سَرح -

۹۹ - عیاضؓ ابن زُہَیر (بعض نے ان کی جگہ ربیعہ بن ہلال کا نام لکھا ہے) -

۱۰۰ - عمروؓ ابن الحارث بن زُہَیر -

۱۰۱ - عثمانؓ بن عبد غَنم بن زُہَیر -

۱۰۲ - سعدؓ (یا سعید) بن عبدقیس -

۱۰۳ - حارثؓ بن عبدِ قیس -

مکہ میں اس ہجرت کا ردّ عمل اس ہجرت سے مکے کے گھر گھر میں کہرام مچ گیا، کیونکہ قریش کے بڑے اور چھوٹے خاندانوں میں سے کوئی ایسا نہ تھا جس کے چشم و چراغ ان مہاجرین میں شامل نہ ہوں۔ کسی کا بیٹا گیا تو کسی کا داماد، کسی کی بیٹی گئی تو کسی کا بھائی اور کسی کی بہن۔ ابوجہل کا بھائی سَلَمہؓ بن ہشام، اس کے چچا زاد بھائی ہشامؓ بن ابی حُذَیفہ اور عیّاشؓ بن ابی ربیعہ، اور اس کی چچا زاد بہن حضرت اُمّ سَلَمہؓ، ابوسفیان کی بیٹی اُمّ حَبیبہؓ، عُتبہ بن ربیعہ کے بیٹے اور ہندِ جگر خوار کے سگے بھائی ابوحُذَیفہؓ، سُہیل بن عمرو کے بھائی، بیٹے، بیٹیاں اور داماد، اسی طرح دوسرے سردارانِ قریش اور مشہور دشمنانِ اسلام کے اپنے جگر گوشے دین کی خاطر گھر بار چھوڑ کر نکل کھڑے ہوئے تھے۔ اس لیے مکے کا کوئی گھر ایسا نہ تھا جو اس واقعہ سے متاثر نہ ہوا ہو۔ بعض لوگ اس کی وجہ سے اسلام دشمنی میں پہلے سے زیادہ سخت ہو گئے، اور بعض کے دلوں پر اس کا اثر ایسا ہوا کہ آخرکار وہ مسلمان ہو کر رہے۔

حضرت ابوبکرؓ کا ارادۂ ہجرت اس پر قریش کو ایک چرکا اور لگا اور وہ یہ تھا کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جیسے بلند مرتبہ شخص بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت لے کر مکہ سے نکل کھڑے ہوئے تاکہ دوسرے مہاجرین سے جا ملیں۔ بخاری میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ جب وہ بَرکُ الغِماد[1] پہنچے (جو مکہ سے

[1] اس مقام کے تلفّظ میں اختلاف ہے۔ ہم نے جو تلفظ لکھا ہے وہ فتح الباری سے ماخوذ ہے۔ مُعجَمُ البُلدان میں بِرکُ الغِماد ہے اور ایک اور تلفظ بِرکُ الغُماد بھی منقول ہوا ہے۔

یمن کی جانب پانچ دن کی راہ پر ہے) تو قبیلہ قارہ کا سردار ابن الدُّغُنَّہ (یا ابن الدَّغِنَہ) ان کو ملا۔ ابن اسحاق نے زُہری عن عُروَہ عن عائشہ کی سند سے بیان کیا ہے کہ مکہ سے ایک یا دو دن کی راہ گئے تھے کہ ابن الدغنہ سے ان کی ملاقات ہوئی جو اس زمانے میں اَحابیش کا سردار تھا۔ اس نے کہا کہ ابوبکر، کدھر کا ارادہ ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ "میری قوم نے مجھے نکال دیا ہے، سخت اذیتیں دی ہیں، اور زندگی تنگ کر دی ہے۔" اس نے کہا "کیوں؟ ابوبکر، تم جیسا آدمی نہیں نکل سکتا اور نہیں نکالا جا سکتا۔ خدا کی قسم، تم تو معاشرے کی زینت ہو، نادار کو کما کر دیتے ہو، صلہ رحمی کرتے ہو، عاجز و درماندہ کا بار اُٹھاتے ہو، مہمان نوازی کرتے ہو، اور نیک کاموں میں مدد کرتے ہو۔ واپس چلو، میں تمہیں اپنی پناہ میں لیتا ہوں، اپنے شہر ہی میں اپنے رب کی عبادت کرو۔" پھر وہ حضرت ابوبکرؓ کو ساتھ لے کر مکہ آیا اور اشرافِ قریش کے پاس جا جا کر اس نے کہا کہ ابوبکرؓ جیسا آدمی نہیں نکل سکتا اور نہیں نکالا جا سکتا۔ کیا تم ایسے آدمی کو نکالتے ہو جس میں یہ یہ خوبیاں ہیں؟ ابن اسحاق کی روایت میں ہے کہ اس نے مکہ میں اعلان کیا کہ میں نے ابو قُحافہ کے بیٹے کو پناہ دی ہے، اب کوئی ان کے ساتھ بھلائی کے سوا کچھ اور سلوک نہ کرنے پائے۔

قریش نے اس کی پناہ رد نہ کی، مگر یہ شرط لگائی کہ ابوبکرؓ اپنے گھر میں جس طرح چاہیں اپنے رب کی عبادت کریں اور جو چاہیں پڑھیں، لیکن ہمیں اذیت نہ دیں کہ بلند آواز سے پڑھنے لگیں، یا اپنے گھر سے باہر پڑھنا شروع کر دیں۔ کیونکہ اس سے ہمیں خطرہ ہے کہ ہماری عورتیں اور بچے فتنے میں پڑ جائیں گے۔ (حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ حضرت ابوبکرؓ کتنی مدت تک اس طرح رہے)۔ پھر انہوں نے اپنے گھر کے احاطے میں ایک مسجد بنائی اور اس میں نماز پڑھنے اور قرآن مجید کی تلاوت کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ان کی قرأت میں ایسا سوز تھا، ایسی کشش تھی کہ مشرکین کی عورتیں اور ان کے بچے اور نوجوان ہجوم کر کے آتے اور قرآن سننے کے لیے ایک دوسرے پر ٹوٹے پڑتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ قرآن پڑھتے پڑھتے رونے لگتے اور سننے والوں پر اس کا اور زیادہ اثر ہوتا۔ اس پر مشرکینِ قریش کے سردار گھبرا اُٹھے۔ انہوں نے ابن الدغنہ کو بلا بھیجا اور اس سے کہا کہ "ہم نے تمہاری خاطر ان کو پناہ دی تھی تاکہ یہ اپنے گھر میں اپنے رب کی عبادت کریں۔ مگر انہوں نے اپنے گھر کے احاطے میں مسجد بنا کر علی الاعلان نماز اور قرآن پڑھنا شروع کر دیا ہے جس سے ہمیں اندیشہ ہے کہ یہ ہماری عورتوں اور بچوں کو فتنے میں ڈال دیں گے۔ ان کو اس سے روکو۔ یا تو یہ خاموشی سے اپنے رب کی عبادت کریں، یا پھر اگر انہیں علانیہ ہی یہ کام کرنے پر اصرار ہے تو ان سے کہو کہ تمہارا ذمہ

واپس کر دیں، کیونکہ ہم تمہارے ذمہ کو توڑنا نہیں چاہتے"۔ ابن الدغنہ نے جاکر حضرت ابوبکرؓ سے یہی بات کہی اور کہا کہ میں نہیں چاہتا کہ عرب میں یہ بات مشہور ہو کہ میں نے ایک شخص کو پناہ دی تھی اور میری پناہ کو توڑ ڈالا گیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا، اچھا تو میں تمہارا ذمہ تمہیں واپس کرتا ہوں اور اللہ کے ذمے پر راضی ہوں۔ ابن الدغنہ اُٹھا اور اس نے جا کر قریش کے لوگوں سے کہہ دیا کہ ابوبکرؓ نے میرا ذمہ واپس کر دیا ہے، اب تم جانو اور تمہارا آدمی۔

مہاجرین کو واپس لانے کے لیے نجاشی کے پاس مشرکین کا وفد ہجرت کے بعد قریش کے سردار سر جوڑ کر بیٹھے اور انہوں نے طے کیا کہ عبداللہ بن ابی ربیعہ[۱] (ابوجہل کے ماں جائے بھائی) اور عَمرو بن عاص کو بہت سے قیمتی تحائف کے ساتھ حبش بھیجا جائے اور یہ لوگ کسی نہ کسی طرح نجاشی (شاہِ حبش) کو اس بات پر راضی کریں کہ وہ ان مہاجرین کو مکہ واپس بھیج دے۔

حضرت ام سلمہؓ کی روایت ام المومنین حضرت ام سلمہؓ، جو خود مہاجرینِ حبشہ میں شامل تھیں، یہ واقعہ بڑی تفصیل کے ساتھ بیان فرماتی ہیں، جسے ابن اسحاق اور امام احمد نے اُن سے روایت کیا ہے۔ وہ فرماتی ہیں کہ قریش کے یہ دونوں ماہرِ سیاست سفیر ہمارے تعاقب میں حبش پہنچے۔ پہلے انہوں نے نجاشی کے اعیانِ سلطنت میں خوب خوب ہدیے تقسیم کر کے سب کو اس پر راضی کر لیا کہ وہ مہاجرین کو واپس کرنے کے لیے بادشاہ پر بالاتفاق زور دیں گے۔ پھر نجاشی سے ملے اور اس کو بیش قیمت نذرانے دینے کے بعد کہا کہ" ہمارے شہر کے چند نادان لونڈے بھاگ کر آپ کے ہاں آ گئے ہیں اور قوم کے اَشراف نے ہمیں آپ کے پاس ان کی واپسی کی درخواست کرنے کے لیے بھیجا ہے۔ یہ لڑکے ہمارے دین سے بھی نکل گئے ہیں اور آپ کے دین میں بھی داخل نہیں ہوئے ہیں، بلکہ انہوں نے ایک نرالا دین نکال لیا ہے"۔ ان کا کلام ختم ہوتے ہی اہلِ دربار ہر طرف سے بولنے لگے کہ" ایسے لوگوں کو ضرور واپس کر دینا چاہیے۔ ان کی قوم کے لوگ زیادہ جانتے ہیں کہ اُن میں کیا عیب ہے۔ اُنہیں رکھنا ٹھیک نہیں ہے"۔ مگر نجاشی نے بگڑ کر کہا کہ" اس طرح تو میں انہیں حوالے نہیں کروں گا۔ جن لوگوں نے دوسرے ملک کو چھوڑ کر میرے ملک پر اعتماد کیا ہے اور یہاں پناہ لینے کے لیے آئے ہیں۔

---

[۱] بہت سے لوگوں نے عبداللہ بن ربیعہ لکھا ہے لیکن ابن ہشام نے بن ابی ربیعہ لکھا ہے۔ یہ حضرت عیاشؓ بن ابی ربیعہ کا سگا بھائی تھا۔

ان سے میں بے وفائی نہیں کر سکتا۔ پہلے میں انہیں بلا کر تحقیق کروں گا کہ یہ لوگ ان کے بارے میں جو کچھ کہتے ہیں اس کی حقیقت کیا ہے"۔ چنانچہ نجاشی نے اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے دربار میں بلا بھیجا۔

نجاشی کا پیغام پاکر سب مہاجرین جمع ہوئے اور انہوں نے باہم مشورہ کیا کہ بادشاہ کے سامنے کیا کہنا ہے۔ آخر سب نے بالاتفاق یہ فیصلہ کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تعلیم ہمیں دی ہے ہم تو وہی بے کم و کاست پیش کریں گے، خواہ نجاشی ہمیں رکھے یا نکال دے۔ دربار میں پہنچے تو چھوٹتے ہی نجاشی نے سوال کیا کہ "یہ تم لوگوں نے کیا کیا کہ اپنی قوم کا دین بھی چھوڑا اور میرے دین میں بھی داخل نہ ہوئے، نہ دنیا کے دوسرے ادیان ہی میں سے کسی کو اختیار کیا؟ آخر یہ تمہارا نیا دین ہے کیا"؟ اس پر مہاجرین کی طرف سے جعفرؓ بن ابی طالب نے ایک برجستہ تقریر[1] کی جس میں پہلے عربِ جاہلیت کی دینی، اخلاقی اور معاشرتی خرابیوں کو بیان کیا، پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا ذکر کر کے بتایا کہ آپ کیا تعلیمات پیش فرماتے ہیں، پھر اُن مظالم کا ذکر کیا جو آنحضورؐ کی پیروی اختیار کرنے والوں پر قریش کے لوگ ڈھا رہے تھے، اور اپنا کلام اس بات پر ختم کیا کہ دوسرے ملکوں کے بجائے ہم نے آپ کے ملک کا رُخ اس اُمید پر کیا ہے کہ یہاں ہم پر ظلم نہ ہوگا۔ نجاشی نے یہ تقریر سُن کر کہا کہ ذرا مجھے وہ کلام تو سُناؤ جو تم کہتے ہو کہ خدا کی طرف سے تمہارے

---

[1] حضرت جعفرؓ کی تقریر کے جو الفاظ ابن اسحاق نے حضرت ام سلمہؓ کی روایت سے نقل کیے ہیں وہ یہ ہیں: "اے بادشاہ، ہم ایک جاہلیت میں پڑی ہوئی قوم تھے۔ بُت پوجتے تھے، مُردار کھاتے تھے، فحش کام کرتے تھے، قطع رحمی کرتے تھے، ہمسائگی اور عہد و امان کا پاس کرنے میں بُرا رویہ رکھتے تھے، اور ہم میں سے طاقت ور کمزور کو کھائے جاتا تھا۔ ہم اسی حال میں تھے کہ اللہ نے ہماری طرف خود ہم میں سے ایک رسول بھیجا جس کے نسب، جس کی صداقت، جس کی امانت اور جس کی پاکدامنی کو ہم جانتے تھے۔ اس نے ہمیں اللہ کی طرف بلایا کہ ہم اس کی توحید کے قائل ہوں، اور اسی کی عبادت کریں اور اُن پتھروں اور بُتوں کو چھوڑ دیں جن کی عبادت ہم اور ہمارے باپ دادا کرتے تھے۔ اس نے ہمیں راست گوئی، امانت داری، صلۂ رحمی، ہمسائیگی اور عہد و پیمان کی پاسداری کا اور حرام افعال اور خونریزی سے باز رہنے کا حکم دیا۔ ہم کو فواحش سے، جھوٹ سے، مال یتیم کھانے سے، پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانے سے روکا۔ ہمیں صرف اللہ واحد کی عبادت کرنے اور کسی چیز کو اس کے ساتھ شریک نہ کرنے کی تلقین کی۔ اور ہمیں نماز پڑھنے، زکوٰۃ دینے اور روزہ رکھنے کی ہدایت کی (ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ اسی طرح حضرت جعفرؓ نے اسلام کے دوسرے احکام اس کو بتائے)۔ (باقی برصفحہ ۱۹)

نبی پر اترا ہے۔ حضرت جعفرؓ نے جواب میں سورۂ مریم کا وہ ابتدائی حصہ سُنایا جو حضرت یحییٰؑ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام سے متعلق ہے۔ نجاشی اس کو سُنتا رہا اور روتا رہا یہاں تک کہ اس کی ڈاڑھی تر ہوگئی۔ اس کے پادری بھی رو دیے اور ان کے مصاحف بھی آنسوؤں سے تر ہوگئے۔ جب حضرت جعفرؓ نے تلاوت ختم کی تو اس نے کہا کہ یقیناً یہ کلام اور جو کچھ حضرت عیسیٰؑ لائے تھے، دونوں ایک ہی سرچشمے سے نکلے ہیں۔ خدا کی قسم میں تمہیں ان لوگوں کے حوالے نہ کروں گا۔ اور قریش کے سفیروں سے کہا، واپس جاؤ، بخدا میں ان لوگوں کو تمہارے سپرد ہرگز نہ کروں گا، یہ کبھی نہیں ہوسکتا۔

پھر حضرت ام سلمہؓ بیان کرتی ہیں کہ عبداللہ بن ابی ربیعہ ہمارے معاملے میں کچھ نرم تھا اور چاہتا تھا کہ ہم بچ جائیں۔ مگر عمرو بن عاص نے کہا کہ خدا کی قسم، میں کل وہ بات پیش کروں گا جو ان لوگوں کی جڑ کاٹ دے گی۔ میں نجاشی کو بتاؤں گا کہ یہ عیسیٰ ابن مریم کو محض بندہ قرار دیتے ہیں۔ عبداللہ نے کہا ایسا نہ کرو، یہ ہمارے مخالف ہی سہی، مگر ہیں تو ہمارے ہی بھائی بند اور ان کا کچھ حق ہم پر ہے۔ عمرو بن عاص نے اس کی ایک نہ سُنی اور دوسرے روز نجاشی سے کہا کہ "ذرا ان لوگوں کو بُلا کر ان سے یہ تو پوچھیے کہ عیسیٰؑ ابن مریم کے بارے میں ان کا عقیدہ کیا ہے۔ یہ لوگ اُن کے متعلق ایک بڑی بات کہتے ہیں" نجاشی نے پھر مہاجرین کو بُلا بھیجا۔ مہاجرین کو پہلے ہی عمرو بن عاص کی چال کا علم ہوچکا تھا۔ انہوں نے جمع ہو کر پھر مشورہ کیا کہ اگر نجاشی نے عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں سوال کیا تو کیا جواب دو گے؟ موقع بڑا نازک تھا اور سب اس سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۸) پس ہم نے اس کی تصدیق کی اور اس پر ایمان لائے، اور جو کچھ وہ اللہ کی طرف سے لایا تھا اس میں اس کی پیروی کی۔ ہم نے صرف اللہ کی عبادت کی اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا۔ جس چیز کو اس نے ہم پر حرام کر دیا اُسے ہم نے حرام کیا اور جس کو اس نے ہمارے لیے حلال کر دیا اُسے ہم نے حلال کیا۔ اس پر ہماری قوم ہم پر ٹوٹ پڑی، اُس نے ہم کو عذاب دیے، اور دین کے معاملہ میں ہم پر ظلم توڑے تاکہ ہم کو اللہ تعالیٰ کی عبادت سے بتوں کی عبادت کی طرف پھیر دے، اور ہم ان تمام خباثت کو پھر سے حلال کرلیں جنہیں پہلے حلال کیے ہوئے تھے۔ آخر کار جب انہوں نے ہم پر سختی کی اور ظلم ڈھایا اور ہماری زندگی تنگ کر دی اور ہمارے دین کے راستے میں حائل ہوگئے تو ہم آپ کے ملک کی طرف نکل آئے اور دوسروں کے بجائے آپ کے ہاں آنا پسند کیا اور آپ کی پناہ لینی چاہی، اس اُمید پر کہ اے بادشاہ، آپ کے ہاں ہم پر ظلم نہ ہوگا۔"

پریشان تھے۔ مگر پھر بھی اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی فیصلہ کیا کہ جو کچھ ہونا ہے ہو جائے، ہم تو وہی بات کہیں گے جو اللہ نے فرمائی اور اللہ کے رسولؐ نے سکھائی ہے۔ چنانچہ جب یہ لوگ دربار میں گئے اور نجاشی نے عمرو بن العاص کا پیش کردہ سوال ان کے سامنے دُہرایا تو جعفرؓ بن ابی طالب نے اٹھ کر بلا تأمل کہا کہ ھو عبد اللہ ورسولہ وروحہ وکلمتہ القاھا الی مریم العذراء البتول۔ "وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں اور اس کی طرف سے ایک رُوح اور ایک کلمہ ہیں جسے اللہ نے کنواری مریم پر القا کیا تھا" نجاشی نے سُن کر ایک تنکا زمین سے اُٹھایا اور کہا "خدا کی قسم، جو کچھ تم نے کہا ہے عیسٰیؑ اس سے اِس تنکے کے برابر بھی زیادہ نہیں تھے"۔ اس پر وہ پادری جو گردوپیش بیٹھے تھے پھنکارنے لگے۔ مگر نجاشی نے کہا واللہ بات یہی ہے خواہ تم کتنا ہی پُھنکارو۔ پھر اُس نے ہم سے کہا کہ جاؤ، تم میری زمین میں امن سے رہو۔ جو تمہیں بُرا کہے گا وہ سزا پائے گا۔ اگر مجھے سونے کا پہاڑ بھی ملے تو اس کے عوض میں تمہیں ستانا پسند نہ کروں گا۔ پھر اس نے حکم دیا کہ دونوں سفیروں کو اُن کے ہدیے واپس کردو، مجھے ان کی کوئی ضرورت نہیں۔ اللہ نے جب میرا ملک مجھے واپس دلایا تھا تو مجھ سے کوئی رشوت نہ لی تھی کہ میں اللہ کے معاملے میں رشوت لوں۔

حضرت عبداللہؓ بن مسعود کی روایت | اس واقعہ کے ایک دوسرے عینی شاہد حضرت عبداللہؓ بن مسعود ہیں جو اُس مجلس میں موجود تھے۔ مُسندِ احمد اور طبرانی میں ان کی روایت یہ ہے کہ مہاجرینِ حبشہ کو جب نجاشی نے اپنے دربار میں بُلایا اور حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سُنیں تو کہا "واللہ، یہ لوگ اُس سے زیادہ کچھ نہیں کہتے جو ہم عیسٰی علیہ السلام کے متعلق کہتے ہیں۔ مرحبا تم کو اور اُس ہستی کو جس کے ہاں سے تم آئے ہو۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ اللہ کے رسول ہیں، اور وہی ہیں جن کا ذکر ہم انجیل میں پاتے ہیں، اور وہی رسول ہیں جن کی بشارت عیسٰی ابن مریم نے دی تھی"۔

حضرت عبداللہؓ بن مسعود کی روایت میں یہ ذکر بھی ہے کہ قریش کے دونوں سفیروں نے نجاشی کے دربار میں حاضر ہو کر پہلے اس کو سجدہ کیا، پھر اس کے دائیں بائیں بیٹھ گئے اور کہا کہ ہمارے بنی عم میں سے کچھ لوگ آپ کے ہاں آئے ہیں اور ہم سے اور ہمارے دین سے الگ ہوگئے ہیں۔ اس پر نجاشی نے مہاجرین کو بُلا بھیجا۔ حضرت جعفرؓ نے کہا آج میں تم سب کی طرف سے بولوں گا۔ چنانچہ سب اُن کے پیچھے چلے۔ دربار میں داخل ہو کر حضرت جعفرؓ نے سلام کیا۔ درباریوں نے کہا سجدہ کیوں نہیں کرتے؟ حضرت جعفرؓ نے کہا

ہم خدا کے سوا کسی کو سجدہ نہیں کرتے۔ اس کے بعد بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی تعلیمات تک پہنچی، اور پھر حضرت عیسیٰؑ ابن مریم کے متعلق مسلمانوں کے عقیدے کا ذکر آیا۔ اس روایت میں نجاشی کا یہ قول بھی نقل کیا گیا ہے کہ اس نے حضورؐ کی تصدیق کرنے کے بعد کہا "خدا کی قسم اگر میں بادشاہی کی ذمہ داریوں میں پھنسا ہوا نہ ہوتا تو آن کی خدمت میں حاضر ہوتا، اُن کی جوتیاں اٹھاتا اور ان کو وضو کراتا"۔

حضرت ابوموسیٰؓ اشعری کی روایت اسی سے ملتی جلتی روایت حضرت ابوموسیٰؓ اشعری سے حافظ ابونعیم اور بیہقی نے نقل کی ہے۔ اس میں یہ اضافہ ہے کہ مہاجرین کے پہنچنے سے پہلے قریش کے وفد نے نجاشی کو بھڑکانے کے لیے کہا کہ دیکھ لیجیے گا، یہ لوگ آپ کو سجدہ نہ کریں گے۔ جب ہم دربار میں پہنچے تو پادریوں اور راہبوں نے کہا بادشاہ کو سجدہ کرو۔ حضرت جعفرؓ نے فرمایا ہم اللہ عزّوجلّ کے سوا کسی کو سجدہ نہیں کرتے۔ آگے بڑھ کر جب ہم نجاشی کے سامنے پہنچے تو اُس نے حضرت جعفرؓ سے کہا تمھیں کس چیز نے مجھے سجدہ کرنے سے باز رکھا؟ انھوں نے پھر وہی جواب دیا کہ ہم اللہ کے سوا کسی کو سجدہ نہیں کرتے۔ آگے وہی قصہ ہے جو حضرت عبداللہؓ بن مسعود نے بیان کیا ہے اور آخر میں یہ اضافہ ہے کہ نجاشی نے ہم لوگوں سے کہا کہ میری زمین میں تم جب تک چاہو رہو اور ہمارے لیے کھانے اور کپڑے کا حکم دیا۔

خود حضرت جعفرؓ کی روایت حافظ ابن عساکر اور طبرانی نے خود حضرت جعفرؓ کا بیان اُن کے صاحبزادے عبداللہ بن جعفر کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ اس میں یہ اضافہ ہے کہ قریش کے وفد کی شکایت کے جواب میں جب ہم نے اپنے اور ان کے دینی اختلاف کی وضاحت کی، تو نجاشی نے قریش کے سفیروں سے پوچھا کیا یہ تمھارے غلام ہیں؟ انھوں نے کہا نہیں۔ اس نے پوچھا کیا تمھارا ان پر کوئی قرض آتا ہے؟ انھوں نے کہا نہیں۔ اس نے کہا تو پھر چھوڑ دو انہیں۔ پھر حضرت جعفرؓ بھی وہی قصہ بیان کرتے ہیں جو دوسرے حضرات نے بیان کیا ہے کہ عمرو بن العاص نے نجاشی کے سامنے حضرت عیسیٰؑ ابن مریم کے متعلق ہمارے عقیدے کا قصہ چھیڑا اور جب ہم نے اپنا عقیدہ بیان کیا تو اس نے اس کی تصدیق کی۔ پھر اُس نے ہم سے پوچھا کہ یہاں کوئی تمھیں تکلیف تو نہیں دیتا؟ ہم نے کہا ہاں۔ اس پر منادی کرا دی گئی کہ جو کوئی ان لوگوں میں سے کسی کو ستائے گا اسے چار درہم جرمانہ کیا جائے گا۔ نجاشی نے ہم سے پوچھا کیا یہ کافی ہے؟ ہم نے کہا نہیں۔ تب اس نے جرمانہ دوگنا کر دیا۔

مہاجرین کا راستبازانہ کردار مہاجرینِ حبشہ نے نہ صرف یہ ثابت کر دیا کہ جس حق پر وہ ایمان لائے ہیں اس

پر ایمان رکھنے میں وہ اتنے مخلص ہیں کہ اس کی خاطر گھر بار، اعزہ و اقربا، کاروبار اور جائدادیں، اور ملک و وطن سب کو چھوڑ کر جلاوطنی کے مصائب برداشت کرنے کے لیے تیار ہو گئے، بلکہ یہ بھی ثابت کر دیا کہ اس جلاوطنی کی حالت میں بھی جبکہ ان کا کوئی سہارا نہ تھا، وہ حق کے معاملہ میں کوئی مداہنت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ان کی یہ قوت ایمانی حیرت انگیز تھی کہ انہوں نے عین دربار شاہی میں ایسے نازک موقع پر اٹھ کر حضرت عیسیٰؑ کے متعلق اپنا عقیدہ صاف صاف بیان کر دیا جبکہ نجاشی کے تمام اہل دربار رشوت کھا کر انہیں اُن کے دشمنوں کے سپرد کر دینے پر تُل گئے تھے۔ اُس وقت اس امر کا پورا خطرہ تھا کہ مسیحیت کے بنیادی عقائد پر اسلام کا بے لاگ تبصرہ سُن کر نجاشی بھی بگڑ جائے گا اور ان مظلوم مسلمانوں کو قریش کے قصائیوں کے حوالے کر دے گا۔ مگر اس کے باوجود انہوں نے کلمۂ حق پیش کرنے میں ذرّہ بھر تامُّل نہ کیا۔ اِسی چیز نے دُنیا کو دکھا دیا کہ اسلام کی دعوت کو کیسے مضبوط کردار کے سرفروش پیرو بہم پہنچے ہیں۔

حبش سے عیسائیوں کے وفد کی آمد مہاجرین کے اخلاق و کردار اور ان کی دعوت کا جو اثر اہلِ حبش پر پڑا اس کا اندازہ اِس واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ وہاں سے ۲۰ عیسائیوں کا ایک وفد مکّہ آ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ملا۔ اس واقعہ کو ابن ہشام اور بیہقی وغیرہ نے محمد بن اسحاق کے حوالہ سے اسی طرح روایت کیا ہے کہ ہجرتِ حبشہ کے بعد جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور دعوت کی خبریں حبش کے ملک میں پھیلیں تو وہاں سے ۲۰ کے قریب عیسائیوں کا ایک وفد تحقیقِ حال کے لیے مکّہ معظمہ آیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مسجد حرام میں ملا۔ (ایک روایت میں یہ ہے کہ ایک مجلس میں ملا اور کچھ سوالات کیے)۔ قریش کے بہت سے لوگ بھی یہ ماجرا دیکھ کر گرد و پیش کھڑے ہو گئے۔ وفد کے لوگوں نے حضورؐ سے کچھ سوالات کیے جن کا آپؐ نے جواب دیا۔ پھر آپؐ نے ان کو اسلام کی دعوت دی اور قرآن مجید کی آیات ان کے سامنے پڑھیں۔ قرآن سُن کر اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور انہوں نے اس کے کلام اللہ ہونے کی تصدیق کی اور حضورؐ پر ایمان لے آئے۔ جب مجلس برخاست ہوئی تو ابوجہل اور اس کے چند ساتھیوں نے ان لوگوں کو راستہ میں جا لیا اور انہیں سخت ملامت کی کہ "بڑے نامراد ہو تم لوگ، تمہارے ہم مذہب لوگوں نے تم کو اس لیے بھیجا تھا کہ تم اِس شخص کے حالات کی تحقیق کر کے آؤ اور انہیں ٹھیک ٹھیک خبر دو، مگر تم ابھی اس کے پاس بیٹھے ہی تھے کہ اپنا دین چھوڑ کر اس پر ایمان لے آئے۔ تم سے زیادہ احمق گروہ تو کبھی ہماری نظر سے نہیں گزرا۔" اس پر انہوں نے جواب دیا کہ "سلام ہے بھائیو تم کو۔ ہم تمہارے ساتھ

جہالت بازی نہیں کرسکتے۔ ہمیں ہمارے طریقے پر چلنے دو اور تم اپنے طریقے پر چلتے رہو، ہم اپنے آپ کو جان بوجھ کر بھلائی سے محروم نہیں رکھ سکتے۔" اسی واقعہ کا ذکر سورۂ قصص میں آیا ہے:

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ۔ وَاِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖٓ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَآ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِيْنَ۔ (آیات ۵۲-۵۳)	جن لوگوں کو ہم نے اس سے پہلے کتاب دی تھی وہ اس قرآن پر ایمان لاتے ہیں۔ اور جب وہ انہیں سنایا جاتا ہے تو کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لائے۔ یہ واقعی حق ہے ہمارے رب کی طرف سے۔ ہم اس سے پہلے بھی اسی دینِ اسلام پر تھے۔
وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَقَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِى الْجٰهِلِيْنَ (آیت ۵۵)	اور جب انہوں نے بیہودہ بات سنی تو یہ کہہ کر اس سے کنارہ کش ہوگئے کہ ہمارے اعمال ہمارے لیے ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے لیے، تم کو سلام ہے، ہم جاہلوں کا سا طریقہ اختیار کرنا نہیں چاہتے۔"

حبشہ سے واپس آنے والے مہاجرین کی پہلی قسط

اس مقام پر یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ مہاجرینِ حبشہ میں سے ایک گروہ تو حضرت جعفرؓ کے ساتھ حبشہ ہی میں رہا اور جنگِ خیبر کے موقع پر واپس آیا۔ اور بہ حسبِ ذیل حضرات ابن اسحاق کی روایت کے مطابق مختلف اوقات میں حضورؐ کی ہجرت الی المدینہ سے پہلے واپس آگئے:۔

حضرت عثمانؓ اور ان کی اہلیہ حضرت رقیہؓ بنت رسول اللہ۔ حضرت ابو حذیفہؓ بن عتبہ بن ربیعہ اور ان کی اہلیہ سہلہؓ بنت سہیل بن عمرو۔ حضرت عبداللہؓ بن جحش۔ حضرت عتبہؓ بن غزوان۔ حضرت زبیرؓ بن العوام۔ حضرت مصعبؓ بن عمیر۔ حضرت سویبطؓ بن سعد بن حرملہ۔ حضرت طلیبؓ بن عمیر۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف۔ حضرت مقدادؓ بن عمرو۔ حضرت عبداللہؓ بن مسعود۔ حضرت ابوسلمہؓ اور ان کی بیوی حضرت ام سلمہؓ۔ حضرت شماسؓ بن عثمان۔ حضرت سلمہؓ بن ہشام (ان کو مکہ میں قید کر لیا گیا)۔ حضرت عیاشؓ بن ابی ربیعہ (یہ مدینہ کی طرف ہجرت کے لیے نکلے تھے مگر ان کے ماں جائے بھائی ابوجہل اور حارث بن ہشام دھوکہ دے کر انہیں پکڑ لائے)۔ حضرت معتبؓ بن عوف۔ حضرت عثمانؓ بن مظعون اور ان کے بیٹے حضرت سائبؓ اور ان کے دونوں بھائی قدامہؓ اور عبداللہؓ۔ حضرت خنیسؓ بن حذافہ۔ حضرت ہشامؓ بن عاص بن وائل (یہ

بھی مکہ میں قید کر لیے گئے)۔ حضرت عامرؓ بن ربیعہ اور ان کی بیوی لیلیٰؓ بنت ابی حثمہ۔ حضرت عبداللہؓ بن مخرمہ۔ حضرت عبداللہؓ بن سُہیل بن عمروؓ (انہیں مکہ میں قید کرکے ان کے باپ نے ان پر اتنا ظلم کیا کہ یہ بظاہر کافر بن گئے اور دل میں مسلمان رہے۔ جنگ بدر کے موقع پر کفار کے ساتھ گئے اور عین حالتِ جنگ میں مسلمانوں سے جا ملے)۔ حضرت ابو سبرہؓ بن ابی رُہم اور ان کی بیوی ام کلثومؓ بنت سہیل بن عمرو۔ حضرت سکرانؓ بن عمرو (ابن اسحاق اور واقدی کا بیان ہے کہ ان کا انتقال مکہ آکر ہوا، اور موسیٰ بن عقبہ اور ابو معشر کہتے ہیں کہ یہ حبش ہی میں انتقال کر چکے تھے)۔ حضرت سودہؓ بنت زمعہ۔ حضرت سعدؓ بن خولہ۔ حضرت ابو عبیدہؓ بن الجراح۔ حضرت عمروؓ بن الحارث۔ حضرت سُہیلؓ بن بیضاء۔ حضرت عمروؓ بن ابی سرح۔

سورۂ رُوم کی پیشینگوئی ہجرتِ حبشہ ہی کے زمانے میں ایک بڑا اہم واقعہ پیش آیا جو آخرکار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کی صداقت کا ناقابلِ انکار ثبوت بن گیا، اور کسی کے پاس اُس کی کوئی توجیہ اس کے سوا ممکن نہ رہی کہ قرآن فی الواقع اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو بذریعہ وحی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتا ہے۔ یہ سورۂ روم کی ابتدائی آیات کا نزول تھا جن میں فرمایا گیا تھا کہ ”رومی قریب کی سرزمین میں مغلوب ہوگئے ہیں، اور اپنی اِس مغلوبیت کے بعد چند سال کے اندر وہ غالب ہو جائیں گے۔ اللہ ہی کا اختیار ہے پہلے بھی اور بعد میں بھی۔ اور وہ دن وہ ہوگا جبکہ اللہ کی بخشی ہوئی فتح پر مسلمان خوشیاں منائیں گے“ (آیات ۲ تا ۴)۔ اس کا مختصر قصہ ہم یہاں بیان کرتے ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے ۸ سال پہلے کا واقعہ ہے کہ قیصرِ رُوم ماریس (MAURICE) کے خلاف بغاوت ہوئی اور ایک شخص فوکاس (PHOCAS) تختِ سلطنت پر قابض ہوگیا۔ اُس نے پہلے تو قیصر کی آنکھوں کے سامنے اُس کے پانچ بیٹوں کو قتل کرایا، پھر خود قیصر کو قتل کرکے باپ بیٹوں کے سر قسطنطنیہ میں بر سرِ عام لٹکوا دیے، اور اس کے چند روز بعد اس کی بیوی اور تین لڑکیوں کو بھی مروا ڈالا۔ اس واقعہ سے ایران کے بادشاہ خسرو پرویز کو رُومی سلطنت پر حملہ آور ہونے کے لیے ایک بہترین اخلاقی بہانہ مل گیا۔ قیصر ماریس اُس کا محسن تھا۔ اُسی کی مدد سے پرویز کو ایران کا تخت نصیب ہوا تھا اور اُسے وہ اپنا باپ کہتا تھا۔ اِس بنا پر اُس نے اعلان کیا کہ میں غاصب فوکاس سے اِس ظلم کا بدلہ لوں گا جو اس نے میرے مجازی باپ اور اُس کی اولاد پر ڈھایا ہے۔ ۶۰۳ء میں اس نے سلطنتِ روم کے خلاف جنگ کا آغاز کیا اور چند سال کے اندر وہ فوکاس کی فوجوں کو پے در پے

شکستیں دیتا ہوا ایک طرف ایشیائے کوچک میں اِڈِیسیا (موجودہ اُورفا) تک اور دوسری طرف شام میں حَلَب اور اَنطاکِیہ تک پہنچ گیا۔ روم کے اعیانِ سلطنت یہ دیکھ کر کہ فوکاس ملک کو نہیں بچا سکتا، افریقہ کے گورنر سے مدد کے طالب ہوئے۔ اُس نے اپنے بیٹے ہِرَقل (HERACLIUS) کو ایک طاقت ور بیڑے کے ساتھ قسطنطنیہ بھیج دیا۔ اس کے پہنچتے ہی فوکاس معزول کر دیا گیا، اس کی جگہ ہرقل قیصر بنا دیا گیا، اور اس نے برسرِ اقتدار آ کر فوکاس کے ساتھ وہی کچھ کیا جو اس نے ماریس کے ساتھ کیا تھا۔ یہ ۶۱۰ء کا واقعہ ہے اور یہ وہی سال ہے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی طرف سے منصب نبوت پر سرفراز ہوئے۔

خُسرو پرویز نے جس اخلاقی بہانے کو بنیاد بنا کر جنگ چھیڑی تھی، فوکاس کے عزل اور قتل کے بعد وہ ختم ہو چکا تھا۔ اگر واقعی اُس کی جنگ کا مقصد غاصب فوکاس سے اس کے ظلم کا بدلہ لینا ہوتا تو اُس کے مارے جانے پر اسے نئے قیصر سے صلح کر لینی چاہیے تھی۔ مگر اس نے پھر بھی جنگ جاری رکھی، اور اب اس جنگ کو اس نے مجوسیت اور مسیحیت کی مذہبی جنگ کا رنگ دے دیا۔ عیسائیوں کے جن فرقوں کو رومی سلطنت کے سرکاری کلیسا نے مُلحِد قرار دے کر سالہا سال سے تختۂ مشقِ ستم بنا رکھا تھا (یعنی نَسطوری اور یعقوبی وغیرہ) ان کی ساری ہمدردیاں بھی مجوسی حملہ آوروں کے ساتھ ہو گئیں۔ اور یہودیوں نے بھی مجوسیوں کا ساتھ دیا، حتّٰی کہ خسرو پرویز کی فوج میں بھرتی ہونے والے یہودیوں کی تعداد ۲۶ ہزار تک پہنچ گئی۔

ہِرَقل آ کر اس سیلاب کو نہ روک سکا۔ تخت نشین ہوتے ہی پہلی اطلاع جو اُسے مشرق سے ملی وہ انطاکیہ پر ایرانی قبضے کی تھی۔ اس کے بعد ۶۱۳ء میں دمشق فتح ہوا۔ پھر ۶۱۴ء میں بیت المقدِس پر قبضہ کر کے ایرانیوں نے مسیحی دنیا پر قیامت ڈھا دی۔ ۹۰ ہزار عیسائی اس شہر میں قتل کیے گئے، ان کا سب سے زیادہ مقدس کلیسا کنیسۃ القیامہ (HOLY SEPULCHRE) برباد کر دیا گیا۔ اصلی صلیب جس کے متعلق عیسائیوں کا عقیدہ تھا کہ اُسی پر مسیح نے جان دی تھی، مجوسیوں نے چھین کر مدائن (ایران کے دارالسلطنت) پہنچا دی، لاٹ پادری زکریاہ کو بھی وہ پکڑ کر لے گئے اور شہر کے تمام بڑے بڑے گرجوں کو انھوں نے مسمار کر دیا۔ اس فتح کا نشہ جس بُری طرح خسرو پرویز پر چڑھا تھا اس کا اندازہ اُس خط سے ہوتا ہے جو اُس نے بیت المقدِس سے ہِرقل کو لکھا تھا۔

اس میں وہ کہتا ہے:-

"سب خداؤں سے بڑے، تمام روئے زمین کے مالک، خسرو کی طرف سے اس کے کمینہ اور بے شعور بندے ہرقل کے نام،

تو کہتا ہے کہ تجھے اپنے رب پر بھروسہ ہے۔ کیوں نہ تیرے رب نے یروشلم کو میرے ہاتھ سے بچا لیا؟"

اس فتح کے بعد ایک سال کے اندر اندر ایرانی فوجیں اردن، فلسطین اور جزیرہ نمائے سینا کے پورے علاقے پر قابض ہو کر حدودِ مصر تک پہنچ گئیں۔ یہ وہی زمانہ تھا جب مکہ معظمہ میں ایک اور اس سے بدرجہا زیادہ تاریخی اہمیت رکھنے والی جنگ برپا تھی۔ یہاں توحید کے علمبردار سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں، اور شرک کے پیرو کار سردارانِ قریش کی رہنمائی میں ایک دوسرے سے برسرِ جنگ تھے، اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ ۶۱۵ء (۵ بعد بعثت) میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کو اپنا گھر بار چھوڑ کر حبش کی عیسائی سلطنت میں (جو روم کی حلیف تھی) پناہ لینی پڑی۔ اُس وقت سلطنتِ روم پر ایران کے غلبے کا چرچا ہر زبان پر تھا۔ مکے کے مشرکین اس پر بغلیں بجا رہے تھے اور مسلمانوں سے کہتے تھے کہ دیکھو ایران کے آتش پرست مشرکین فتح پا رہے ہیں اور وحی و رسالت کے ماننے والے عیسائی شکست پر شکست کھاتے چلے جا رہے ہیں۔ اسی طرح ہم عرب کے بت پرست بھی تمہیں اور تمہارے دین کو مٹا کر رکھ دیں گے۔

ان حالات میں قرآن مجید کی یہ سورہ نازل ہوئی اور اس میں یہ پیشین گوئی کی گئی کہ "قریب کی سرزمین میں رومی مغلوب ہو گئے ہیں، مگر اس مغلوبیت کے بعد چند سال کے اندر ہی وہ غالب آجائیں گے، اور وہ دن وہ ہوگا جب کہ اللہ کی دی ہوئی فتح سے اہل ایمان خوش ہو رہے ہوں گے"۔ اس میں ایک کے بجائے دو پیشین گوئیاں تھیں۔ ایک یہ کہ رومیوں کو غلبہ نصیب ہوگا۔ دوسری یہ کہ مسلمانوں کو بھی اسی زمانے میں فتح حاصل ہوگی۔ بظاہر دور دور تک کہیں اس کے آثار موجود نہ تھے کہ ان میں سے کوئی ایک پیشین گوئی بھی چند سال کے اندر پوری ہو جائے گی۔ ایک طرف مٹھی بھر مسلمان تھے جو مکے میں مارے اور کھدیڑے جا رہے تھے اور اس پیشین گوئی کے بعد بھی آٹھ سال تک ان کے لیے غلبہ و فتح کا کوئی امکان کسی کو نظر نہ آتا تھا۔ دوسری طرف روم کی مغلوبیت روز بروز بڑھتی چلی گئی۔

۶۱۹ء تک پورا مصر ایران کے قبضے میں چلا گیا اور مجوسی فوجوں نے طرابلس کے قریب پہنچ کر اپنے جھنڈے گاڑ دیے۔ ایشیائے کوچک میں ایرانی فوجیں رومیوں کو مارتی دباتی باسفورس کے کنارے تک پہنچ گئیں اور ۶۱۷ء میں انہوں نے عین قسطنطنیہ کے سامنے خلقدون (CHALCEDON - موجودہ قاضی کوئی) پر قبضہ کر لیا۔ قیصر نے خسرو کے پاس ایلچی بھیج کر نہایت عاجزی کے ساتھ درخواست کی کہ میں ہر قیمت پر صلح کرنے کے لیے تیار ہوں۔ مگر اس نے جواب دیا کہ "اب میں قیصر کو اس وقت تک امان نہ دوں گا جب تک وہ پابزنجیر میرے سامنے حاضر نہ ہو اور اپنے خدائے مصلوب کو چھوڑ کر خداوند آتش کی بندگی اختیار نہ کر لے۔" آخر کار قیصر اس حد تک شکست خوردہ ہو گیا کہ اس نے قسطنطنیہ چھوڑ کر قرطاجنہ (CARTHAGE، موجودہ ٹیونس) منتقل ہو جانے کا ارادہ کر لیا۔ غرض انگریز مؤرخ گبن کے بقول، "قرآن مجید کی اس پیشین گوئی کے بعد بھی سات آٹھ برس تک حالات ایسے تھے کہ کوئی شخص یہ تصور تک نہ کر سکتا تھا کہ رومی سلطنت ایران پر غالب آجائے گی، بلکہ غلبہ تو درکنار اُس وقت تو کسی کو یہ امید بھی نہ تھی کہ اب یہ سلطنت زندہ رہ جائے گی۔"[1]

قرآن کی یہ آیات جب نازل ہوئیں تو کفارِ مکہ نے ان کا خوب مذاق اُڑایا اور اُبی بن خلف نے حضرت ابوبکرؓ سے شرط بدی کہ اگر تین سال کے اندر رومی غالب آگئے تو دس اُونٹ میں دوں گا ورنہ دس اونٹ تم کو دینے ہوں گے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس شرط کا علم ہوا تو آپؐ نے فرمایا کہ قرآن مجید میں فِی بِضْعِ سِنِیْنَ کے الفاظ آئے ہیں، اور عربی زبان میں بِضع کا اطلاق دس سے کم پر ہوتا ہے، اس لیے دس سال کے اندر کی شرط کرو اور اُونٹوں کی تعداد بڑھا کر سَو کر دو۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے اُبی سے پھر بات کی اور نئے سرے سے یہ شرط طے ہوئی کہ دس سال کے اندر فریقین میں سے جس کی بات غلط ثابت ہوگی وہ سَو اُونٹ دے گا۔

۶۲۲ء میں اِدھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ طیبہ تشریف لے گئے، اور اُدھر قیصر ہرقل خاموشی کے ساتھ قسطنطنیہ سے بحرِ اسود کے راستے طرابزون کی طرف روانہ ہوا جہاں اس نے ایران پر پشت کی طرف سے حملہ کرنے کی تیاری کی۔ اس جوابی حملے کی تیاری کے لیے قیصر نے کلیسا سے روپیہ مانگا اور مسیحی کلیسا کے اُسقفِ اعظم سرجیس (SERGIUS) نے مسیحیت کو مجوسیت سے بچانے کے لیے

[1] GIBBON, DECLINE AND FALL OF THE ROMAN EMPIRE, VOL. II, P. 788; MODREN LIBRARY, NEW YORK.

گرجاؤں کے نذرانوں کی جمع شدہ دولت اُسے سُود پر قرض دی - ہرقل نے اپنا حملہ ۶۲۳ء میں ارمینیا سے شروع کیا اور دوسرے سال ۶۲۴ء میں اس نے اذربیجان میں گھس کر زرتشت کے مقامِ پیدائش اُرمیاہ (CLORUMIA) کو تباہ کر دیا اور ایرانیوں کے سب سے بڑے آتش کدے کی اینٹ سے اینٹ بجا دی - خدا کی قدرت کا کرشمہ دیکھیے کہ یہی وہ سال تھا جس میں مسلمانوں کو بدر کے مقام پر پہلی مرتبہ مشرکین کے مقابلے میں فیصلہ کن فتح نصیب ہوئی - اس طرح وہ دونوں پیشین گوئیاں جو سورۂ روم میں کی گئی تھیں، دس سال کی مدت ختم ہونے سے پہلے بیک وقت پوری ہوگئیں -

پھر روم کی فوجیں ایرانیوں کو مسلسل دباتی چلی گئیں - نینوی کی فیصلہ کن لڑائی (۶۲۷ء) میں انہوں نے سلطنتِ ایران کی کمر توڑ دی، اس کے بعد شاہانِ ایران کی قیام گاہ دستگرد (دَسْکَرَۃُ الْمَلِكِ) کو تباہ کر دیا اور آگے بڑھ کر روم کے لشکر عین طَيْسَفُون (CTESIPHON - مدائن) کے سامنے پہنچ گئے جو اس وقت ایران کا دارالسلطنت تھا - ۶۲۸ء میں خسرو پرویز کے خلاف خود اس کے گھر میں بغاوت رونما ہوئی - وہ قید کیا گیا، اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے ۱۸ بیٹے قتل کر دیے گئے، اور اس کا بیٹا شیرویہ اسے قتل کر کے تخت پر قابض ہوگیا - یہی سال تھا جس میں صلحِ حُدَیْبِیَہ واقع ہوئی جسے قرآن مجید "فتحِ عظیم" کے نام سے تعبیر کرتا ہے، اور یہی سال تھا جس میں شاہ ایران نے تمام رومی مقبوضات سے دست بردار ہو کر اور اصلی صلیب واپس کر کے روم سے صلح کر لی - ۶۲۹ء میں قیصر "مقدس صلیب" کو اس کی جگہ رکھنے کے لیے خود بیت المَقْدِس گیا، اور اسی سال نبی صلی اللہ علیہ وسلم عُمْرَۃُ القضاء ادا کرنے کے لیے ہجرت کے بعد پہلی مرتبہ مکہ معظمہ میں داخل ہوئے -

اس کے بعد کسی کے لیے بھی اس امر میں شبہ کی گنجائش باقی نہ رہی کہ قرآن کی پیشین گوئی بالکل سچی تھی - عرب کے بکثرت مشرکین اس پر ایمان لے آئے، اُبَیّ بن خَلَف کے وارثوں کو ہار مان کر شرط کے اونٹ ابوبکر صدیقؓ کے حوالے کرنے پڑے، اور وہ انہیں لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے - آپؐ نے حکم دیا کہ انہیں صدقہ کر دیا جائے - کیونکہ یہ شرط اس وقت ہوئی تھی جب شریعت میں جوئے کی حرمت کا حکم نہیں آیا تھا، مگر اب حرمت کا حکم آچکا تھا، اس لیے حربی کافروں سے شرط کا مال تو لے لینے کی اجازت دے دی گئی، مگر ہدایت کی گئی کہ وہ اسے خود استعمال کرنے کے بجائے صدقہ کر دیں -

(باقی)

مکمل تعلیمی انقلاب کی منفرد آواز

از جناب نعیم صدیقی صاحب

کسی قوم کی حقیقی آزادی کا نقطۂ آغاز دراصل باہر کے مسلط کردہ نظریات و تصورات کے سلاسل و اغلال سے اس کے ایمان و فکر کا آزاد ہونا ہے۔ بیرونی سیاسی استیلا کے خاتمے اور کسی سامراجی طاقت سے نجات پالینے سے تو محض اس امر کا موقع پیدا ہوتا ہے کہ آزادی کی سمت میں گامزن ہونے والی قوم خارجی مداخلت کے اندیشے سے فارغ ہو کر اپنے جہانِ افکار کو تعمیر کر سکے، اپنے قومی تشخص کو اس کے مخصوص تہذیبی خدوخال کے سانچے تاریخی حوادث کے اس ملبے سے نکال کر اور گرد و غبار سے پاک کر کے از سرِ نو استوار کر سکے جس کے تودے کے تودے سامراجی یلغار کے نتیجے میں معاشرے کے ہر گوشے میں نمودار ہو جایا کرتے ہیں۔ مگر ہم لوگ جنہیں اللہ کے فضل و کرم سے برطانوی شہنشاہیت اور اس کے سلیبے میں پل پوس کر ہمیں دبوچ لینے کی تیاری کرنے والے برہمنی مہاجنی سامراج سے نجات پائے آج ۲۹ سال پورے ہونے کو ہیں، اب تک ہمارے معاشرے کے افق سے ایمان و فکر کا خورشیدِ زندگی افروز طلوع نہیں ہوا۔ ابھی ہم حقیقی آزادی کے اس نقطۂ آغاز تک پہنچنے کے لیے نت نئے راہزنوں کا دامن تھام کر خوف اور محرومیوں کی وادی میں ٹامک ٹوئیے مارتے پھرتے ہیں۔

ہماری ۲۹ سالہ داستان آزادی کتنی دکھ بھری ہے! اس مدت میں ہمارے سروں سے کبھی خون کی موجیں گزر گئیں اور کبھی آگ کی لہریں۔ یہاں تک کہ ہمارا نو تشکیل یافتہ وطن دو لخت ہو کر رہ گیا۔

تعمیر معاشرہ میں تعلیم کی اہمیت دراصل ایمان و فکر کو کسی بھی نقشے پر نشو و نما دینے میں کسی قوم کے نظامِ تعلیم کو بہت ہی مؤثر دخل حاصل ہوتا ہے۔ نظامِ تعلیم ہی نئی نسلوں کو کسی بلند نصب العین کی طرف پرواز کرنے کے لیے فکر و حکمت کے بال و پر دیتا ہے۔ مگر ہماری مصیبت یہ ہوئی کہ ہم آزادی کے ۲۹ سال گزار کر بھی

رخصت ہو جانے والی سامراجی قوت کے بنائے ہوئے اس تعلیمی قفس میں گرفتار ہیں جس کی شان ہی یہ رہی ہے کہ نہ وہ بال و پر اُگنے دیتا ہے اور نہ ذوقِ پرواز ہی سے اپنے پروردگان کو بہرہ مند ہونے دیتا ہے۔ یہ قفسِ تعلیم نہ جانے کیوں ایک ایسی مقدس میراث قرار پا گیا ہے کہ اس میں اب تک معمولی قسم کے ردّ و بدل سے آگے بڑھ کر کسی حکمراں قوت نے یہ سوچنے تک کی جرأت نہیں کی کہ اس قفس کو توڑ کر ملت کا اپنا ایک آزاد نشیمن وجود میں لایا جائے۔ دوسرے لفظوں میں ہم تعلیمی غلامی سے نجات پانے کے قابل نہیں ہو سکے۔

قومی زندگی میں نظامِ تعلیم کی وہی حیثیت ہے جو فرد کے لیے اس کے دماغ کی ہوتی ہے۔ اگر دماغ کسی ساحر کی ساحری اور کسی سامری کے طلسم کا شکار ہو جائے تو فرد کی ساری حرکات و سکنات اسی کے منشاء کے مطابق نمودار ہوں گی، خواہ وہ اپنی جگہ یہ سمجھتا رہے کہ وہ اپنی آزاد سوچ سے ہر اقدام کر رہا ہے۔ اگر اس کے اپنے دینی اور ملی اور خاندانی رجحانات کے خلاف متضاد قسم کے تہذیبی افکار و تصورات اس کے دماغ میں فاتحانہ شان سے گھس کر مستقل محاذ آرائی کی کیفیت پیدا کر دیں تو اس کے عقیدے اور افکار ہر لمحہ ایک ایسی جنگِ مسلسل سے دوچار رہیں گے جس میں روز اس کے اصول و روایات میں سے کچھ موت کے گھاٹ اُتر جاتے ہیں اور کچھ زخمی اور اپاہج ہو کے رہ جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں پراگندگیٔ افکار اور ذہنی انتشار کے روگ سے کوئی بچاؤ نہیں۔ ایسے ہی تضادات کے غیر مختتم تصادم کی وجہ سے بسا اوقات دماغ بالکل ہی چل جاتا ہے اور پھر جسم و اعضا کی تمام حرکات لایعنی بلکہ تخریبی ہو کے رہ جاتی ہیں۔ ٹھیک اسی طرح اگر ایک قوم کا نظامِ تعلیم فساد و اختلال کی کسی بھی خاص صورت کا شکار ہو جائے تو اس قوم کی تمام سیاسی، معاشی اور ثقافتی سرگرمیوں میں بگاڑ اور ضرر پیدا ہو جاتا ہے۔

نظامِ تعلیم جو مسلط ہے

بدقسمتی سے ہم جس نظامِ تعلیم سے دوچار ہیں وہ ہمارے قومی وجود اور تہذیبی تشخص سے غیر ہم آہنگ اور ہر لحظہ برسرِ تصادم ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ معاشرے کے کسی بھی شعبے کی کل سیدھی نہیں اور جو پہلے کچھ سیدھی تھی بھی، وہ بھی روز بروز ٹیڑھی ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن کار فرما قوتوں نے کبھی تعلیم کے بنیادی نقطے پر صحیح طور پر توجہ ہی نہیں دی۔

ہماری متذکرہ بنیادی قومی کوتاہی کے نتائجِ بد کی فصل ہمارے چاروں طرف لہلہا رہی ہے۔ ذہنی بانجھ پن، لامقصدیت، جعل سازی، خیانت، ضمیر فروشی، ناشائستگی، قانون شکنی، بے ضابطگی، ہوس پرستی اور فحش پسندی کے روگ کتنے عام ہیں۔ اخلاقی کوڑھ میں اضافہ کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ ہر شخص کام کے بغیر

یا قلیل وقت میں کم کام کر کے جلد سے جلد بہت کچھ حاصل کر لینے کے درپے ہے۔ انفرادی اور قومی آمدنیوں کی افزائش سے پہلے معیارِ زندگی کو اونچا کرتے جانے کا ماحصل اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ جائز و ناجائز کی تمیز اٹھ جائے۔ حد یہ ہے کہ لوگ قوم کو بے وقوف بنا کر اور قومی مفاد کو بیچ کر ذاتی زندگی کی جنتیں آراستہ کرتے ہیں۔ یہ خرابی احوالِ تعلیم کی توسیع کے ساتھ ساتھ تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ اس وجہ سے اس کی زیادہ تر ذمہ داری نظامِ تعلیم پر جاتی ہے۔ راقم کا مدعا یہ ہے کہ مسئلہ تعلیم کسی قوم کا بے حد اہم اور بالکل اہم مسئلہ ہے اور اس پر توجہ نہ دی جائے تو سارا معاشرہ چوپٹ ہو کے رہ جاتا ہے۔

مولانا مودودی کے تعلیمی افکار پر تحقیقی کام

ہماری تاریخ میں اپنے وقت کے حالات کو ملحوظ رکھ کر سرسید ایک تعلیمی اسکیم لے کر اٹھے تھے، لیکن اس اسکیم کا جو وقتی مقصد تھا وہ اپنے اچھے اور برے پہلوؤں کے ساتھ حاصل ہو چکا، اور اب دورِ آزادی میں ایک آزاد مسلم ریاست کے لیے وہ اسکیم ذرہ بھر کار آمد نہیں رہی۔

اس برصغیر میں آزادی ملنے سے کچھ عرصہ پہلے صحیح اسلامی زاویہ نگاہ سے پہلی بار ایک مکمل تعلیمی انقلاب کی آواز اٹھی۔ یہ مولانا مودودی کی آواز تھی۔ صرف آواز ہی نہیں اٹھی، بلکہ آہستہ آہستہ مولانا نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں ایک جامع حکمتِ تعلیم، اس پر عمل پیرا ہونے کی اسکیم اور اس کے لیے نصابیات وغیرہ مسائل پر اتنا مواد ہمارے سامنے رکھ دیا کہ اگر مولانا مودودی اور کوئی کام نہ کرتے تو یہی ایک کارنامہ انہیں ہماری تاریخ کی ایک عظیم شخصیت بنانے کے لیے کافی تھا۔

مولینا مودودی ماضی سے لے کر حال تک پھیلی ہوئی اس صفِ رجال میں سے ہیں جس کے ہر فرد کا سانحہ یہ ہے کہ اس کے سرچشمۂ علم سے استفادہ کرنے والے مخلصین کے مقابلے میں اس پر کیچڑ پھینکنے والوں کا انبوہ ہمیشہ کثیر التعداد رہا ہے۔ دراصل زمانہ ہر اس شخص سے انتقام لیتا ہے جو اس کے دھارے کا رُخ بدلنے کی سعی کرے۔ مولینا مودودی نے یہ انقلابی سعی نہ صرف تعلیم کے دائرے میں کی بلکہ دینی شعور و حکمت کے دائرے میں، سیاست و اقتصادیات کے دائرے میں، معاشرت و ثقافت کے دائرے میں اور دستور و قانون کے دائرے میں بھی پرزور طریق سے جاری رکھی۔ اتنے بڑے جرم کی کچھ تو پاداش ہونی چاہیے تھی۔ مگر معاندین و حاسدین کے اٹھائے ہوئے طوفانوں کے درمیان قوم کے کچھ ذہین عناصر آہستہ آہستہ مولانا مودودی کے پیغام کے خدوخال کو پہچاننے لگے اور ان کے افکار سے استفادہ کرنے والوں

کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔[۱۵]

سب سے پہلے ہمیں گذشتہ پچاس سال سے نشوونما پاتی ہوئی تاریخ | ہر نظامِ تعلیم کسی تہذیب کا خادم ہوتا ہے!

کی وسعتوں میں تعلیمی انقلاب کے داعی کی حیثیت کو مشخص کر لینا چاہیے۔ اس طرح ان کے افکار و اصطلاحات کو سمجھنا سہل تر ہو جائے گا۔

اصل میں مولینا مودودی مسلمانوں کے خلاف مغرب کی ملحدانہ و نفس پرستانہ تہذیب کی بڑھتی ہوئی فتوحات کے دور میں اُٹھے، اور انہوں نے اس انسانیت کش اور اسلام دشمن تہذیب کی مزاحمت کا مجاہدانہ عزم باندھا اور کچلی پسی ہوئی مسلمان قوم کے اندر سے بیدار دل، زندہ ضمیر اور محکم ایمان افراد کی بچی کھچی تعداد کو اپنی دردمندانہ پکار سے اُٹھا کر ایک محاذ پہ لا کھڑا کیا۔

کوئی شخص جو اپنی تہذیب کے احیاء اور بیرونی تہذیب کی مزاحمت کے لیے اُٹھا ہو، وہ اگر نظامِ تعلیم کے مسئلے سے تعرض نہ کرے تو اس کا شعور کیسے قابلِ اعتماد ہو سکتا ہے۔ چنانچہ مولانا نے جہاں اعتقادی، اخلاقی، سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی موضوعات کو نئے انداز سے چھیڑا، وہاں انہوں نے مروجہ نظامِ تعلیم کو اپنی شدید تنقید کا ہدف بنایا اور اسلامی حکمتِ تعلیم کے خطوط اچھی طرح اجاگر کیے۔ اس سلسلے میں بنیادی کام تو حصولِ آزادی اور تشکیلِ پاکستان سے پہلے ہی ہو چکا تھا۔ مگر پاکستان چونکہ بھاری مسلم اکثریت

---

[۱۵] اسی سلسلہ کی کڑی پنجاب یونیورسٹی کے ادارۂ تعلیم و تحقیق کی نگرانی میں اسی ادارے کے فارغ التحصیل نوجوان جناب پروفیسر محمد حسین صاحب کا وہ تحقیقی مقالہ بھی ہے جس کے لیے یہ افتتاحی سطور لکھنے کا شرف انہوں نے بہ اصرار مجھے دیا ہے۔

محمد حسین صاحب کی یہ خدمت ایک تو اس لحاظ سے بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ پنجاب کے مشہور مرکزی تعلیمی ادارے کے تحت تعلیم ہی کے موضوع پر مولینا مودودی کے خیالات کو تحقیق و ترتیب کے ساتھ سامنے لایا گیا ہے۔ دوسرے یہ اس لحاظ سے بھی قابلِ قدر ہے کہ تعلیم یافتہ طبقے اور تعلیم کے مضمون (SUBJECT) کے اساتذہ و طلبہ کے لیے انہوں نے اسلامی حکمتِ تعلیم پر ایک ایسا مقالہ تیار کر دیا ہے جو ایک طرف تعلیمی انقلاب کی رُوح اپنے اندر لیے ہوئے ہے، اور دوسری طرف وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ موجودہ حالات میں (خصوصاً پاکستان کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے) مجوزہ تعلیمی انقلاب کس طرح روبعمل آنا چاہیے۔

کی مملکت بنا اور اس کو اسلام کے نام پر استوار کیا گیا، اس وجہ سے تعلیم کی بحث کو مولینا مودودی نے اور بھی زور سے آگے بڑھایا۔ یہاں تک کہ اب اسلامی نظامِ تعلیم کا مکمل تصور ان کے آئینۂ افکار میں صاف دکھائی دیتا ہے۔

متذکرہ سطور کی تائید میں میں مولینا مودودی کے چند الفاظ یہاں درج کر رہا ہوں جن سے صاف عیاں ہے کہ مسئلہ تعلیم کو مولینا تہذیبی زاویۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں:۔

"ہر یونیورسٹی کسی کلچر (مولینا نے یہ لفظ بصیغۂ مونث ہی استعمال کیا ہے۔ صدیقی) کی خادم ہوتی ہے۔ ایسی مجرد تعلیم جو ہر رنگ اور ہر صورت سے خالی ہو، نہ آج تک دنیا کی کسی درس گاہ میں دی گئی ہے نہ آج دی جا رہی ہے۔ ہر درسگاہ کی تعلیم ایک خاص رنگ اور ایک خاص صورت میں ہوتی ہے اور اس رنگ و صورت کا انتخاب پورے غور و فکر کے بعد اُس مخصوص کلچر کی مناسبت سے کیا جاتا ہے جس کی خدمت وہ کرنا چاہتی ہے"[۱]

اس موضوع پر میرا مطالعہ اگر قابلِ اعتماد حد تک جامع ہوتا تو میں حتمی طور پر دعویٰ کرتا کہ تعلیم کو ہمارے یہاں مولینا سے پہلے کسی شخص نے اس واضح سائنٹفک نظریے سے نہیں دیکھا اور تعلیم اور تہذیب (یا کلچر) کے ربطِ باہم کو یوں نمایاں نہیں کیا۔ کچھ اقتباس اور:۔

"ترقی علم و تمدن کے موجبِ فلاح یا موجبِ ہلاکت ہونے کا تمام تر انحصار اُس تہذیب پر ہے جس کے زیرِ اثر علوم و فنون اور تمدن و حضارت کا ارتقاء ہوتا ہے۔ ارتقاء کا راستہ، انسانی مساعی کا مقصد اور حاصل شدہ قوتوں کا مصرف متعین کرنے والی چیز دراصل تہذیب ہے"[۲]

"حقیقت میں تعلیم کا مسئلہ ایک مملکت کے بنیادی مسائل میں سے ہے .... اس کے سربراہ کاروں کو سب سے پہلے اس کی فکر ہونی چاہیے تھی"[۳]

"اب اگر ہم اپنی ایک کلچر رکھتے ہیں، ہم ایک ایسی قوم ہیں جس کے اپنے کچھ عقائد ہیں، جس کا اپنا

---

[۱] تنقیحات ساتواں ایڈیشن صفحہ ۳۲۲

[۲] ، ، ، صفحہ ۹۳

[۳] تعلیمات، تیسرا ایڈیشن صفحہ ۲۴

ایک نظریۂ زندگی ہے جس کا اپنا ایک نصب العین ہے، جو اپنی زندگی کے کچھ اصول رکھتی ہے تو لازماً ہمیں اپنی نسلوں کو اِس غرض کے لیے تیار کرنا چاہیے کہ وہ ہماری اس کلچر کو نہ صرف یہ کہ زندہ رکھیں بلکہ آگے انہی بنیادوں پر اُسے ترقی دیں جس پر ہماری یہ کلچر قائم ہے۔ مجھے کوئی قوم ایسی معلوم نہیں جس نے اپنا نظامِ تعلیم خالص معروضی بنیادوں پر قائم کیا ہو اور اپنی نسلوں کو بے رنگ تعلیم دینے کی کوشش کی ہو۔ اسی طرح مجھے ایسی بھی کوئی قوم معلوم نہیں ہے جو دوسروں سے ان کا نظامِ تعلیم جوں کا توں لے لیتی ہو اور اپنی تہذیب کا کوئی رنگ اس میں شامل کیے بغیر اسی سانچے میں اپنی نئی نسلوں کو ڈھالتی چلی جاتی ہو۔[1]

مولانا مودودی نے تعلیمات[2] میں وہ چار وجوہ بیان کیے ہیں جن کی بنا پر موصوف "انقلابِ تعلیم" کو لازم گردانتے ہیں۔ یہاں ہم وجوہ درج نہیں کر رہے، بس واضح یہ کرنا مقصود ہے کہ انقلابِ تعلیم کی اصطلاح بھی خود موصوف کی وضع کردہ ہے اور ان کے تعلیمی افکار میں اس اصطلاح کا مفہوم مرکزی اہمیت رکھتا ہے۔

تعلیمی نظام میں اسلام اور سائنس کا تعلق

نہایت اہم گفتگو وہ ہے جو مولینا نے نظامِ تعلیم کی بحث میں اسلام اور سائنس کے باہمی تعلق کے بارے میں کی ہے۔ اس سے تعلیمی انقلاب کا وہ تصور اور اجاگر ہو جاتا ہے جس کے علمبردار مولینا مودودی ہیں۔ ملاحظہ ہو:۔

"بہت سے لوگ اس خیال کو سن کر بڑے پریشان ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ سائنس کا آخر اسلام سے کیا تعلق، حالانکہ ان کے سامنے روس کی مثال موجود ہے جو سوویٹ سائنس کا قائل ہے۔ کوئی کمیونسٹ اپنے اشتراکی معاشرے کے افراد کو بورژوا سائنس اور بورژوا فلسفہ و تاریخ اور معاشیات و سیاسیات وغیرہ پڑھانا پسند نہیں کرتا۔ وہ ان سب علوم کو مارکسزم کے رنگ میں رنگ کر پڑھاتا ہے تاکہ اشتراکی سائنس دان اور اشتراکی ماہر علوم پیدا ہوں۔ بورژوا نقطۂ نظر سے مرتب کیے ہوئے علوم کو پڑھا کر کوئی اشتراکی معاشرہ نہیں بن سکتا۔"

---

۱ تعلیمات، تیسرا ایڈیشن صفحہ ۱۴۲۔

۲ " " صفحہ ۸۱، ۸۲۔

" یہ کہنا کہ سائنس تو ایک عالمگیر چیز ہے، اس کا کسی مذہب سے کوئی تعلق نہیں، فی الواقع بڑی ناسمجھی کی بات ہے۔ سائنس میں ایک چیز تو ہیں حقائق (FACTS) اور قوانینِ فطرت (NATURAL LAWS) جو تجربے اور مشاہدے سے انسان کے علم میں آتے ہیں۔ یہ بلاشبہ عالمگیر ہیں۔ دوسری چیز ہے وہ ذہن جو ان حقائق اور معلومات کو مرتب کر کے ان پر نظریات قائم کرتا ہے اور وہ زبان جس میں وہ ان کو بیان کرتا ہے۔ یہ چیز عالمگیر نہیں ہے۔ بلکہ اس میں ہر تہذیب کے پیروؤں کا اسلوب الگ الگ ہے اور فطرتاً الگ ہونا چاہیے۔ ہم اس دوسری چیز کو بدلنا چاہتے ہیں نہ کہ پہلی چیز کو۔"[1]

سائنس کے دائرے میں تجربات و مشاہداتِ حواس کے ساتھ مفروضاتِ قیاس مل کر کام کرتے ہیں۔ سائنس کے ایک ایک ذرۂ حقیقت کے گرد بالعموم پورا ایک جہانِ مفروضات تعمیر ہو جاتا ہے اور اصطلاحِ عام میں یہ سب کچھ سائنس کہلاتا ہے۔ مولینا نے ایک مثال دے کر مدعا کو واضح تر کر دیا ہے:

"مثال کے طور پر دیکھیے، یہ ایک سائنٹفک حقیقت ہے کہ دنیا کی تمام دوسری چیزیں تو سرد ہو کر سکڑتی چلی جاتی ہیں مگر اس کے برعکس پانی جب سرد ہوتے ہوتے جمنے کے قریب پہنچتا ہے تو پھیل جاتا ہے اور برف بن کر ہلکا ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے برف سطحِ آب پر تیرنے لگتی ہے۔ یہ ایک امرِ واقعہ ہے۔ اب ایک شخص اس چیز کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ یہ پانی کی خاصیت ہے اور واقعتہً ایسا ہوا کرتا ہے۔ دوسرا شخص اس واقعہ کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ خدا نے اپنی حکمت و ربوبیت سے پانی میں یہ خصوصیت اس لیے رکھی ہے کہ دریاؤں اور تالابوں اور سمندروں میں جاندار مخلوق باقی رہ سکے!

دیکھیے ایک ہی امرِ واقعہ کو دو شخص اپنے اپنے طرزِ فکر کے مطابق دو مختلف طریقوں سے بیان کرتے ہیں اور ہر ایک کا بیان پڑھنے سے آدمی کے ذہن پر دو مختلف اثرات مرتب ہوتے ہیں ....

...... ایک طریقے سے اگر سائنس کو پڑھایا جائے تو اس سے ایک مادہ پرست سائنسدان تیار ہو گا اور دوسرے طریقے سے وہی سائنس پڑھایا جائے (نوٹ مولانا کی عبارت میں یہاں لفظ سائنس مذکر ہی استعمال ہوا ہے۔ صدیقی) تو ایک مسلمان سائنسدان تیار ہو جائے گا۔"[2]

---

[1] تعلیمات ص ۲۳۸، ۲۳۹۔

[2] ایضاً ص ۲۳۹ - ۲۴۱۔

موجودہ سائنس اور اسلامی نقطۂ نظر مروّجہ سائنس جن بنیادی تصورات پر کھڑی ہے ان میں اس سے زیادہ غیر عقلی تصور شاید ہی کوئی ہو کہ سائنس جہانِ مادّی کے ایک ایک ذرے پر "قانون" کی کارفرمائی کا دعویٰ کرتی ہے، لیکن اتنے وسیع و بے پایاں عقلی قانونی نظام کے بارے میں وہ یہ رائے رکھتی ہے کہ اس سارے عقلی نظامِ قانون نے غیر عقلی "اتفاق" سے جنم لیا ہے۔ سیدھی سی بات ہے کہ جہاں قانون ہے وہاں تمہیں کسی حکیم و علیم قانون ساز کے وجود کو ماننا ہوگا اور قانون کے صحیح طور پر مسلسل چلتے رہنے کے معنی یہ ہیں کہ وہ قانون کو چلانے کے لیے قانون ساز قوت کے ساتھ اقتدار بھی رکھتا ہے۔ لیکن مادّہ پرستوں کی مرتب کردہ سائنس کی اتنی بڑی عقلی حماقت کو نظامِ تعلیم کے واسطے سے ہم مسلمانوں نے بلاکسی ردّوکد کے قبول کر لیا ہے۔ فی الحقیقت سائنس نام ہے ان مساعی کا جن کے ذریعے ہم خدا کے جاری کردہ طبعی، تکوینی، جسمانی، حیوانی، نفسیاتی اور تاریخی قوانین کو دریافت کرتے ہیں۔

تعلیمی انقلاب کے داعی نے سائنس کی تعلیم کے بارے میں کلمۂ تکمیل کے طور پر کہا ہے کہ:

"حقیقت یہ ہے کہ سائنس کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جو انسانوں کے دل میں ایمان کو گہری جڑوں سے راسخ کر دینے والا نہ ہو۔ فزکس، بیالوجی، فزیالوجی، اناٹومی، اسٹرانومی، غرض جس علم کو بھی آپ دیکھیں اُس میں ایسے ایسے حقائق سامنے آتے ہیں جو انسان کو پکا اور سچا مومن بنا دینے کے لیے کافی ہیں ـــــ یہی تو وہ آیات الٰہی ہیں جن کی طرف قرآن بار بار توجہ دلاتا ہے۔ مگر صرف اس وجہ سے کہ کافر سائنس دانوں نے ان حقائق کو اپنے نقطۂ نظر سے مرتب اور بیان کیا ہے، اِن کو پڑھ کر آدمی اُلٹا مادّہ پرست اور ملحد بنتا ہے اور خدا کے تصوّر پر ہنستا ہے اور اس کا مذاق اُڑاتا ہے ـــــ ہم بے خدا سائنس اور بے خدا فلسفہ اور بے خدا اجتماعی علوم پڑھا کر خدا پرست انسان تیار نہیں کر سکتے۔"[1]

زیرِ تحقیق انقلابی نظریۂ تعلیم اسلامی فکر کو پورے مضامین و نصابات پر جس طرح غالب و مسلط کر دینا چاہتا ہے اس کا اندازہ سائنس کے متعلق متذکرہ اقتباسات سے بخوبی ہو سکتا ہے۔

نظامِ تعلیم اور مسئلہ قیادت و امامت مولینا مودودی نے ستمبر ۱۹۳۲ء میں لکھا تھا کہ:

"دنیا گویا ایک ریل گاڑی ہے جس کو فکر و تحقیق کا انجن چلا رہا ہے۔"[2]

---

[1] تعلیمات ص ۲۴۱۔ [2] تنقیحات ـ ساتواں ایڈیشن ۱۹۶۳ء، ص ۲۳۔

جنوری ۱۹۴۱ء میں دار العلوم ندوۃ العلما ، میں انجمن اتحاد طلباء کے سامنے جو خطبہ مولینا نے پڑھا، اس میں فرمایا کہ:

" امامت کا دامن ہمیشہ علم سے وابستہ رہے گا "[۱]

دنیائے انسانیت کی امامت یا قیادت (LEADER SHIP) کے اسی تصور کی بنا پر اسلامی یونیورسٹی کا خاکہ مرتب کرتے ہوئے مولینا نے مقصد تعلیم یہ قرار دیا کہ:

" وہ ایسے صالح علما تیار کرے جو اس دور جدید میں ٹھیک ٹھیک دینِ حق کے مطابق دنیا کی رہنمائی کرنے کے لائق ہوں "[۲]

اگر میں یہ کہوں تو شاید بات غلط نہ ہوگی کہ تعلیم و امامت کے اسی تعلق کی بنا پر ۱۹۴۲ء میں دار الاسلام پٹھانکوٹ کی مجلسِ تعلیمی کے سامنے موصوف نے صراحت سے کہا تھا کہ:

" اس وقت ہمارے ملک میں جتنے نظام ہائے تعلیم رائج ہیں ان میں سے کوئی بھی اس مقصد کے لیے آدمی تیار نہیں کرتا جو ہمارے پیش نظر ہے —— ہمیں صرف یہی نہیں کرنا ہے کہ نوخیز نسلوں کی علمی اور ذہنی تربیت کا انتظام اپنے نصب العین کے مطابق کریں بلکہ اس کے ساتھ ان کی اخلاقی اور عملی تربیت کا بندوبست بھی کرنا ہے "[۳]

یہاں بات اصل تصور سے کسی قدر محدود شکل میں سامنے آتی ہے - اس کی وجہ بھی سن لیجیے:

" اس وقت ہم کسی ملک کے انتظام کا چارج نہیں لے رہے ہیں کہ ہمیں اپنے نظامِ تعلیم میں ان ضرورتوں کے لیے آدمی تیار کرنے ہوں جو ایک ملک کے تمدن کی پوری مشینری کو چلانے میں پیش آتی ہیں۔ ہمارے سامنے اس وقت صرف ایک کام ہے اور وہ یہ ہے کہ دنیا میں اخلاقی، فکری اور عمرانی انقلاب برپا کرنے کے لیے موزوں لیڈر اور کارکن تیار کریں "[۴]

بہر حال مولینا جس انقلابی دعوت تعلیم کو لے کر اٹھے ہیں، اس کی رو سے علم و تعلیم اور امامت و قیادت کا چولی دامن کا ساتھ ہے - جو قوم تعلیم اور علم و تحقیق میں آگے بڑھتی ہے، وہی دوسروں کے لیے

---

[۱] تعلیمات، ص ۶۸ -
[۲] تعلیمات، ص ۱۰۴
[۳] تعلیمات، ص ۱۶۸
[۴] تعلیمات، ص ۱۰۵

پیش رو بنتی ہے اور اسی کی تقلید کی جانے لگتی ہے۔ علم اُسے اِس فکری و ذہنی استیلا اور سیاسی و اقتصادی فوقیت کا راستہ بنا کے دیتا ہے۔

اس خاص بحث کے لیے تنقیحات (از مولینا مودودی) کے بیشتر مضامین خصوصاً اس کے پہلے مقالے "ہماری ذہنی غلامی اور اس کے اسباب" سے بہت مفید مواد اخذ کیا جا سکتا ہے۔

نشاۃِ جدید کی ضرورت تعلیم اور امامت کے تعلق کو سامنے رکھ کر نظامِ تعلیم پر سوچنے کے لحاظ سے بھی مولینا بڑی حد تک منفرد مقام رکھتے ہیں اور پھر اس تعلق کی وضاحت بھی انہوں نے اپنی تحریروں میں بڑے زورِ بیان سے کی ہے۔

"علم برائے امامتِ عالم" کے اسی نظریے کے فریم میں تعلیم کے متعلق ان کی انقلابی فکر نصب ہوئی ہے۔ اور اسی کلمے کی روشنی میں ان کے مختصر سے اس فقرے کا مدعا سمجھ میں آ سکتا ہے کہ:

"اسلام میں ایک نشاۃِ جدید (RENNISANCE) کی ضرورت ہے"[۱]

کیونکہ:

"پرانے اسلامی مفکرین و محققین کا سرمایہ اب کام نہیں دے سکتا..... علم و عمل کے میدان میں وہی رہنمائی کر سکتا ہے جو دنیا کو آگے کی جانب چلائے، نہ کہ پیچھے کی جانب۔ لہٰذا اب اگر اسلام دوبارہ دنیا کا رہنما بن سکتا ہے تو اس کی بس یہی ایک صورت ہے کہ مسلمانوں میں ایسے مفکر اور محقق پیدا ہوں جو فکر و نظر اور تحقیق و اکتشاف کی قوت سے ان بنیادوں کو ڈھا دیں جس پر مغربی تہذیب کی عمارت قائم ہے"[۲]۔

اتنا بڑا معرکہ ہے مولینا کے سامنے۔ وہ عالمگیر تسلط رکھنے والی مغربی تہذیب کی عمارت کی بنیادیں ڈھا دینا چاہتے ہیں اور اس کے لیے علم و تحقیق اور نظامِ تعلیم کی قوت کو بر سرِ عمل لانا چاہتے ہیں۔

مسلم تعلیم گاہوں کا ناقدانہ جائزہ مولینا مودودی کی انقلابی تعلیمی فکر کو سمجھنے میں ہمیں وہ تنقیدی تحریریں بہت مدد دیتی ہیں جو جدید اور قدیم ہر دو قسم کی قائم شدہ مسلم تعلیم گاہوں کی اسکیموں کے اساسی تصورات کا احتساب کرتی ہیں۔ کسی ڈھانچے کے اندر جامد ذہن کے لوگ تو سکون سے چلتی رو میں بہتے رہتے ہیں اور کسی ڈھانچے

---

[۱]،[۲] تنقیحات، ساتواں ایڈیشن ۱۹۶۳ء ص ۲۲-۲۳

کے اندر بعض پسندیدہ اجزا دیکھ کر راضی ہو جاتے ہیں۔ پھر کچھ مصلحین ہوتے ہیں جو اساسیات کو چھیڑے بغیر تفصیلی مظاہر میں دو چار تبدیلیوں کے لیے کوشش کرتے ہیں۔ لیکن انقلابی ذہن کا آدمی اساسیات اور ڈھانچے کی مجموعی حیثیت کی غلط ساخت پر گرفت کرتا ہے اور اس میں تبدیلی کی دعوت دیتا ہے۔ جدید و قدیم دونوں قسم کی مسلم تعلیم گاہوں اور ان کی تعلیمی اسکیموں پر مولینا مودودی نے اسی حیثیت سے ناقدانہ نگاہ ڈالی ہے۔

"علی گڑھ یونیورسٹی کا قیام جن امنگوں اور آرزوؤں کے ساتھ کیا گیا تھا ان کے لحاظ سے دیکھیں تو یہ تعلیمی مرکز بڑی تاریخی اہمیت کا حامل تھا۔ اور اس کے داعیٔ اول سرسید احمد خاں کے حصے میں یہ کریڈٹ ضرور جاتا ہے کہ وہ مسلم قوم کے ایک خوفناک دورِ شکست میں فکری لیڈر بن کے ابھرے اور ڈوبتی ہوئی قوم کو بچانے کے لیے جو کچھ بھی ان کی سمجھ میں آیا اس کے لیے جد و جہد شروع کر دی۔

ان کی مساعی کی قیمت وقتی اور فوری بلکہ اضطراری تدبیر کے لحاظ سے جو ہے سو ہے، مگر ان کی اسکیم نے آگے چل کر کچھ اچھے نتائج کے ساتھ جو بہت سے بُرے نتائج پیدا کیے ان کا احساس خود سرسید کو بھی ہو گیا تھا۔ مگر اب جو دریا بہہ نکلا تھا اس کا رُخ بدلنا ان کے بس میں نہ تھا، اور نہ ان کے بعد مضطرب ہو کر اصلاحات کرنے والے کوئی مؤثر اقدام کر سکے۔ خرابی خود اسکیم کے اندر ایسی تھی کہ اس کے سانچے میں ڈھل کر مسلم تہذیب کی علمبرداری کرنے والے اور مغربی تہذیب کے مفاسد کا مقابلہ کرنے والے دل و دماغ پیدا نہ ہو سکتے تھے۔

وہ صرف ابتدائی دور تھا جس کے جذباتی ماحول میں چند قابلِ قدر نمایاں شخصیتیں ابھریں۔ اس کے بعد مسلم قوم پرستوں سے لے کر ملحدوں اور کمیونسٹوں تک کی کھیپیں تیار ہونے لگیں۔ "مسلم بلا اسلام" یا "افرنگ زدہ مسلم" کا نیا کردار بھی اس "اسلامی" ادارے نے ڈھالنا شروع کر دیا ___ اور یہ کردار مسلمانوں کے پیش رو طبقوں میں آج نمایاں دکھائی دیتا ہے اور اس کے کارناموں کے برگ و بار زندگی کے ہر شعبے میں پھیلے ہوئے ملتے ہیں۔

مولانا کا مطالعۂ احوال یہ تھا کہ یہ سب کچھ اتفاقی حادثے کے طور پر نہیں ہو رہا بلکہ علی گڑھ کی تعلیمی اسکیم سے اسی کی توقع کی جا سکتی تھی۔

علی گڑھ کے نظامِ تعلیم پر تبصرہ

آیئے خود مولینا کے الفاظ کے آئینے میں حقیقت کا انعکاس دیکھیں:

"...... علی گڑھ سے جو تعلیمی تحریک اٹھی تھی اس کا وقتی مقصد یہ تھا کہ مسلمان اس نئے دَور کی

ضرورت کے لحاظ سے اپنی دنیا درست کرنے کے قابل ہو جائیں ...... اس وقت اس سے زیادہ کچھ کرنے کا شاید موقع نہ تھا ...... اس وقت اتنی مہلت نہ تھی کہ غور و تفکر کے بعد کوئی ایسی محکم تعلیمی پالیسی متعین کی جاتی جو نقصانات سے پاک اور فوائد سے لبریز ہوتی ...... مسلمانوں کو اس طرز تعلیم کی طرف دھکیل دیا گیا جو ملک میں رائج ہو چکا تھا اور خطرات سے بچنے کے لیے کچھ تھوڑا سا عنصر اسلامی تعلیم و تربیت کا بھی رکھ دیا گیا جس کو جدید تعلیم اور جدید تربیت کے ساتھ کوئی مناسبت نہ تھی ...... اس تحریک نے ہماری دُنیا تو ضرور بنا دی مگر جتنی دُنیا بنائی اس سے زیادہ ہمارے دین کو بگاڑ دیا ...... اس نے ہم میں کالے فرنگی پیدا کیے ...... اس نے ہماری قوم کے طبقۂ عُلیا اور طبقہ متوسط کو جو دراصل قوم کے اعضائے رئیسہ ہیں، باطنی اور ظاہری دونوں حیثیتوں سے یورپ کی مادی تہذیب کے ہاتھ فروخت کر دیا، صرف اتنے معاوضے پر کہ چند عہدے، چند خطاب، چند کرسیاں ایسے لوگوں کو مل جائیں جن کے نام مسلمانوں سے ملتے جلتے ہوں ...... سوال یہ ہے کہ کیا اب دائماً ہماری یہی تعلیمی پالیسی رہنی چاہیے۔ اگر یہی ہماری دائمی پالیسی ہے تو اس کے لیے علی گڑھ کی کوئی ضرورت اب باقی نہیں رہی، ہندستان کے ہر بڑے مقام پر ایک علی گڑھ موجود ہے"[1]

اس تعلیمی پالیسی میں خرابی کی وجہ کیا ہے اس پر بھی مولینا کی رائے سُنیے:

"...... آپ اُن کو (یعنی نئی نسلوں کو) وہ فلسفہ پڑھاتے ہیں جو کائنات کے مسئلے کو خدا کے بغیر حل کرنا چاہتا ہے۔ آپ ان کو وہ سائنس پڑھاتے ہیں جو معقولات سے منحرف اور محسوسات کا غلام ہے۔ آپ ان کو تاریخ، سیاسیات، معاشیات، قانون اور تمام علومِ عمرانی کی وہ تعلیم دیتے ہیں جو اپنے اصول سے لے کر فروع تک اور نظریات سے لے کر عملیات تک اسلام کے نظریات اور اصولِ عمران سے یکسر مختلف ہے۔ اس کے بعد کس بناء پر آپ یہ اُمید رکھتے ہیں کہ ان کی نظر اسلامی نظر ہوگی، ان کی سیرت اسلامی سیرت ہوگی، ان کی زندگی اسلامی زندگی ہوگی؟ قدیم طرز پر قرآن و حدیث اور فقہ کی تعلیم اس نئی تعلیم کے ساتھ بے جوڑ ہے ...... اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے فرنگی اسٹیمر میں پرانے بادبان محض نمائش کے لیے لگا دیے جائیں مگر ان بادبانوں سے فرنگی اسٹیمر قیامت تک اسلامی اسٹیمر نہ بنے گا۔"[2]

---

[1] تعلیمات، ص ۱۸، ۱۹ - [2] تعلیمات، ص ۱۹، ۲۰ -

چند سطور اور ملاحظہ کیجیے:

"اِس وقت مسلم یونیورسٹی میں جو طریقِ تعلیم رائج ہے، وہ تعلیم جدید اور اسلامی تعلیم کی ایک ایسی آمیزش پر مشتمل ہے جس میں کوئی امتزاج اور کوئی ہم آہنگی نہیں ...... یہ دونوں عنصر نہ صرف ایک دوسرے سے الگ رہتے ہیں بلکہ ایک دوسرے کی مزاحمت کر کے طلبہ کے ذہن کو دو مخالف سمتوں کی طرف کھینچتے ہیں"[1]

"میری نظر میں مسلم یونیورسٹی کی دینی و دُنیاوی تعلیم بہ حیثیت مجموعی بالکل ایسی ہے کہ آپ ایک شخص کو از سرتاپا غیر مسلم بناتے ہیں، پھر اس کی بغل میں دینیات کی چند کتابوں کا ایک بستہ دے دیتے ہیں"۔

"...... اگر آپ ان حالات اور طرزِ تعلیم کو بعینہٖ جاری رکھیں...... تو اس کا حاصل صرف یہ ہوگا کہ فرنگیت اور اسلامیت کی کشمکش زیادہ شدید ہو جائے گی اور ہر طالب علم کا دماغ ایک رزم گاہ بن جائے گا"[2]

ندوہ کا نظامِ تعلیم | ۵ جنوری ۱۹۴۱ء کو دارالعلوم ندوۃ العلماء کے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے مولانا نے اس تعلیمی ادارے کی اسکیم پر بھی ایک تنقیدی نگاہ ڈالی۔ فرمایا:

"لوگ اس گمان میں ہیں کہ پرانی تعلیم میں خرابی صرف اتنی ہے کہ نصاب بہت پرانا ہوگیا ہے اور اس میں بعض علوم کا عنصر بعض علوم سے کم یا زیادہ ہے اور جدید زمانہ کے بعض علوم اس میں شامل نہیں ہیں۔ اس لیے اصلاح کی ساری بحث اس حد تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے کہ کچھ کتابوں کو نصاب سے خارج کر کے دوسری کتابوں کو داخل کر دیا جائے...... اور بہت زیادہ روشن خیالی پر جو لوگ اُترآتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ صاحب ہر مولوی کو میٹرک تک انگریزی پڑھا کر نکالو، تاکہ کم از کم تار پڑھنے اور لکھنے کے قابل تو ہو جائے...... اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اگر کچھ ہو سکتا ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ پہلے سے کچھ زیادہ کامیاب قسم کے مولوی پیدا ہو جائیں جو کچھ جرمنی اور امریکہ کی باتیں بھی کرنے لگیں۔ اس ذرا سی اصلاح کا نتیجہ یہ کبھی نہیں نکل سکتا کہ دنیا کی امامت و قیادت کی باگیں علمائے اسلام

---

[1] تعلیمات، ص ۲۵۔ [2] تعلیمات، ص ۲۷، ۲۸۔

کے نافذ ہیں آجائیں۔[۱]

مولانا کے نزدیک اس تعلیم کا متوقع ماحصل بس یہ ہے کہ:

"آپ گھٹیا قسم کے نہ سہی، بڑھیا قسم کے مقتدی بن جائیں۔ امامت بہرحال آپ کو نہیں مل سکتی۔ اِس وقت تک جتنی اصلاحی تجویزیں میری نظر سے گزری ہیں وہ سب کی سب بہتر مقتدی بنانے والی ہیں، امام بنانے والی کوئی تجویز ابھی تک سوچی نہیں گئی۔"[۲]

عام قسم کے اسلامی کالج

انگریزی نظامِ تعلیم پر کام کرنے کے لیے جو اسلامی کالج قائم ہوتے رہے ان پر مولانا کی تنقید نسبتاً زیادہ سخت مگر درد بھرے انداز میں سامنے آتی ہے۔ اور اس تنقید میں ان کا ذوق انقلابیت خوب نمایاں ہے۔ ایک ایسے ہی کالج کے جلسۂ تقسیم اسناد کا جو زلزلہ انگن خطبہ مولانا نے دیا اس کے چند جملے پیش ہیں:

"دراصل میں آپ کی اس مادرِ تعلیمی کو، اور مخصوص طور پر اسی کو نہیں بلکہ ایسی تمام مادرانِ تعلیم کو درس گاہ کے بجائے قتل گاہ سمجھتا ہوں، اور میرے نزدیک آپ فی الواقع یہاں قتل کیے جا رہے ہیں اور یہ ڈگریاں جو آپ کو ملنے والی ہیں یہ دراصل موت کے صداقت نامے (DEATH CERTIFICATES) ہیں جو قاتل کی طرف سے آپ کو اس وقت دیے جاتے ہیں جبکہ وہ اپنی حد تک اس بات کا اطمینان کر چکا ہے کہ اس نے آپ کی گردن کا تسمہ تک لگا رہنے نہیں دیا ہے...... میری مثال اس شخص کی سی ہے جو اپنے بھائی بندوں کا قتل عام ہو چکنے کے بعد لاشوں کے ڈھیر میں یہ ڈھونڈتا پھرتا ہو کہ کہاں کوئی سخت جان بسمل ابھی سانس لے رہا ہے۔"[۳]

اس سلسلے میں آگے چل کر مولانا نے کہا کہ:

"ہر قوم کے بچے دراصل اس کے مستقبل کا محضر ہوتے ہیں۔ قدرت کی طرف سے یہ محضر ایک سادہ لوح کی شکل میں آتا ہے اور قوم کو یہ اختیار دیا جاتا ہے کہ وہ خود اس پر اپنے مستقبل کا فیصلہ لکھے۔ ہم وہ دیوالیہ قوم ہیں جو اس محضر پر اپنے مستقبل کا فیصلہ خود لکھنے کے بجائے اسے

۱۔ تعلیمات ص ۶۶-۶۷
۲۔ تعلیمات ص ۷۳
۳۔ تعلیمات ص ۵۳-۵۴-

دوسروں کے حوالے کر دیتے ہیں کہ وہ اس پر جو چاہیں ثبت کر دیں، خواہ تمہاری اپنی موت ہی کا فتویٰ کیوں نہ ہو۔"[1]

اس نظام تعلیم کا یہ مایوس کن پہلو ہے کہ وہ کوئی مقصد طلبہ کو نہیں دیتا۔ اس کی طرف مولینا نے خصوصی توجہ دی ہے:

"مجھے بکثرت ایسے نوجوانوں سے ملنے کا موقع ملتا ہے جو اعلیٰ تعلیم پا رہے ہیں، یا تازہ تازہ فارغ ہوئے ہیں .... مگر میری مایوسی کی انتہا نہیں رہتی جب میں دیکھتا ہوں کہ مشکل سے ہزاروں میں سے کوئی ایسا ملتا ہے جو اپنے سامنے زندگی کا کوئی مقصد رکھتا ہو .... اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں کی یہ حالت دیکھ کر میرا سر چکرانے لگتا ہے۔ میں حیران ہو کر سوچنے لگتا ہوں کہ اس نظامِ تعلیم کو کس نام سے یاد کروں جو پندرہ بیس سال کی مسلسل دماغی تربیت کے بعد بھی انسان کو اس قابل نہیں بناتا کہ وہ اپنی قوتوں اور قابلیتوں کا کوئی مصرف اور اپنی کوششوں کا کوئی مقصود متعین کر سکے .... یہ انسانیت کو بنانے والی تعلیم ہے یا اس کو قتل کرنے والی؟"[2]

اور اسلامی نقطۂ نگاہ سے:

"کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ موجودہ نظامِ تعلیم میں ملت اسلام کے نونہالوں کی تعلیم و تربیت کے لیے جو انتظام کیا جاتا ہے وہ دراصل ان کو اس ملت کی پیشوائی کے لیے نہیں بلکہ غارت گری کے لیے تیار کرتا ہے؟"[3]

مثبت دعوت مولینا مودودی نے ایک صحیح اسلامی نظامِ تعلیم کے سلسلے میں متعدد اہم چیزیں تحریر کی ہیں، ان کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ یہاں اجمال سے ان کا مرکزی نقطۂ نظر عرض کیا جاتا ہے۔

"اگر فی الحقیقت ہم ایک اسلامی نظامِ تعلیم قائم کرنا چاہتے ہیں تو محض مرمتیں اور داغ دوزیاں کرنے سے کام نہیں چل سکتا بلکہ اس کے لیے ایک انقلابی قدم اٹھانے کی ضرورت ہے۔ درحقیقت اب یہ ناگزیر ہو چکا ہے کہ وہ دونوں نظامِ تعلیم ختم کر دیے جائیں جو اب تک ہمارے

(باقی بر صفحہ ۴۸)

---

[1] تعلیمات ص ۵۸ - [2] تعلیمات ص ۵۹ - ۶۰ -

[3] تعلیمات ص ۶۲ -

مطبوعات

رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ حصہ اوّل
مؤلف: مولانا محمد نافع صاحب
ناشر: دارالتصنیف جامعہ محمدی شریف جھنگ (پاکستان)
صفحات: ۴۶۴ کتابت وطباعت: عمدہ آفسٹ۔
قیمت: -/۲۵ روپے

سورۂ فتح کے آخری رکوع کی ایک آیت میں اصحابِ نبی اکرمؐ کی مابہ الامتیاز خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ وہ کافروں پر سخت اور باہم بڑے رحمدل ہیں (اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ) "رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ" اِس آیت میں مذکور دوسری صفت کا تفصیلی بیان ہے۔

فاضل مؤلف نے اپنی اِس گراں قدر تالیف میں قرآن وسنت اور مستند تاریخی شہادتوں سے اِس گمراہ کن پروپیگنڈے کا پردہ چاک کیا ہے کہ حضرت علیؓ اور اہل بیت، خلفائے ثلاثہؓ، حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ سے ناراض اور اُن کی ناانصافیوں کے شکار رہے۔ انھوں نے مسکت دلائل اور ناقابلِ تردید تاریخی حقائق کی روشنی میں ثابت کیا ہے کہ خلفائے راشدینؓ، صحابۂ کرامؓ اور اہل بیت کے درمیان گہرے تعلقات تھے جو باہمی اُنسیت ومحبت، مروّت ومودّت، شفقت ورأفت اور ایثار وقربانی پر مبنی تھے۔ ان کے درمیان عداوت وخصومت، رنجش وآویزش کی جو داستانیں تصنیف کی گئی ہیں وہ سرتاسر خانہ ساز اور بے بنیاد ہیں۔ اِس کتاب کی خاص خصوصیت یہ ہے کہ اہلِ تشیع کے حق پسند اور صاحب تقویٰ بزرگوں کی آرا بھی فاضل مؤلف نے اپنے دعویٰ کے ثبوت میں پیش کی ہیں جن سے یہ حقیقت اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ خلفائے راشدین نے حضرت علیؓ اور اہل بیت میں سے نہ کسی کا کوئی حق مارا اور نہ اُن سے کوئی ناروا سلوک روا رکھا۔ اسی طرح اہلِ بیت کا رویہ بھی خلفائے راشدین کے ساتھ تعاون واشتراک اور ہمدردی وخیرخواہی کا تھا۔ ساری کتاب میں علمی وقار نمایاں نظر آتا ہے لیکن اِس وقیع تصنیف کے چند مباحث محلِ نظر ہیں۔

صفحہ ۱۳۹ تا ۱۴۵ پر "الزامی جواب" کے عنوان کے تحت جو کچھ تحریر کیا گیا ہے وہ نہ صرف حضرت علیؓ، اہل بیت بلکہ خود حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بھی کوئی اچھا تصور پیش نہیں کرتا۔ مؤلف نے کتاب کے آغاز میں ایک اصول بیان فرمایا ہے کہ جو روایت کتاب وسنت کے خلاف ہو وہ ناقابلِ قبول ہے۔ معلوم نہیں اس مقام پر مؤلف کے پیشِ نظر یہ اصول کیوں نہیں رہا اور الزامی جواب کے جوش میں بے سروپا باتیں کیوں تحریر کر گئے؟

بعض مقامات پر غلط محاورات بھی استعمال ہوئے ہیں مثلاً "کلام کریں گے" کی جگہ "کلام چلائیں گے" (صفحہ ۱۷۸) اور "متہم آدمی" کی جگہ "تہمتناک آدمی" (صفحہ ۱۴۱) استعمال کیا گیا ہے۔

فاضل مؤلف نے "چند تمہیدی امور" (صفحہ ۵) کے زیرِ عنوان روایات کے ترک وقبول کا ایک اصول قائم کیا ہے جس کا لُبِّ لباب یہ ہے کہ جو روایت قرآن وحدیث سے متعارض ہو وہ لائقِ التفات نہیں ہے۔ ہماری رائے میں تاریخی واقعات کی جانچ پڑتال کا یہ معیار صحیح نہیں ہے۔ یہ اصول صرف اعتقادات، معاملات اور احکامات کے بارے میں ہے نہ کہ اہلِ ایمان کے انفرادی اور ذاتی حالات کی تنقیح کے لیے۔ مؤلف کے مذکورہ اصول کو اگر صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اصحابِ رسولؐ کے درمیان صفین وجمل کی جو خونریز جنگیں ہوئیں وہ تاریخی افترا ہی قرار پائیں گی کیونکہ اہل ایمان، خصوصاً صحابہ کرامؓ، کی مابہ الامتیاز شان یہ بیان ہوئی ہے کہ "وہ آپس میں بڑے رحمدل واقع ہوتے ہیں"۔ اسی طرح دورِ رسالتؐ کے بعض اہلِ ایمان کے تسامحات کا انکار بھی لازم آتا ہے حالانکہ وہ قرآنِ مجید کی بے شمار آیات کا شانِ نزول قرار پاتے ہیں۔ کیا ان واقعات کا انکار کر کے ہم کہیں اسی فتنہ کا راستہ تو ہموار نہیں کر رہے جس کے لیے بعض لوگوں نے "انکارِ حدیث" کا شوشہ چھوڑا ہے۔

ہماری رائے میں کتاب بحیثیتِ مجموعی نہایت قابلِ قدر ہے اور سوچنے سمجھنے والوں کے لیے دعوتِ فکر۔ اس کا مطالعہ صحابہ کرامؓ اور خلفائے راشدینؓ کے متعلق پھیلائی گئی بے شمار غلط فہمیوں کے ازالہ کا باعث ہوگا۔ اگر ہماری گزارشات کو قابلِ التفات سمجھتے ہوئے اس کتاب پر نظرِ ثانی کر لی جائے تو یہ تصنیف زیادہ مفید ہو سکتی ہے۔

کتابت وطباعت کا معیار عمدہ ہے اور جلد خوبصورت اور جاذبِ نظر۔

(بقیہ اشارات) قعرِ مذلت میں جا گرتی ہے۔ ٹائن بی نے فلسفہ تاریخ کا تانا بانا اسی تحدّی اور ردِّ عمل کے ارتباط سے بُنا ہے۔ ممکن ہے یہ نظریہ جزوی حد تک تو صحیح ہو لیکن اِس میں سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ آخر یہ کیوں کر فرض کر لیا گیا ہے کہ جس بات کو ٹائن بی صاحب چیلنج کہتے ہیں وہی فی الحقیقت کسی قوم کے فکر و عمل کا بنیادی محرک بھی ہے اور جس چیز کو وہ ردِّ عمل قرار دیتے ہیں وہ لازمی طور پر اسی محرک کے نتیجے میں ہی معرضِ وجود میں آنے والی حرکت ہے۔ تاریخ حالات و واقعات کے باہمی ربط و ضبط کا نہایت ہی پیچیدہ نظام ہے۔ اِس کے عناصر کا علم کیمیا کی طرح سادہ انداز میں تجزیہ نہیں کیا جا سکتا لیکن داد دیجیے مغرب کی ہنر مندی اور چابکدستی کو کہ آج جو شخص بھی مطالعۂ تاریخ کی طرف مائل ہوتا ہے وہ سب سے پہلے تحدّی اور معاکسۂ عمل کے نظریے پر ایمان لا کر تاریخ کے اوراق کو ہاتھ لگاتا ہے۔ چنانچہ اِس غلط نظریے کے زیرِ اثر جو بالکل غلط مفروضات پر مبنی ہے مسلمانوں نے تاریخ کے میدان میں جو نئی علمی کاوشیں پیش کی ہیں وہ اکثر و بیشتر مسلمانوں کے تاریخی سرمایہ کو ضائع کرنے والی ہیں اور جن کے مطالعہ سے یہ تاثر نہایت واضح طور پر اُبھر کر سامنے آتا ہے کہ اسلام نے قرونِ اُولیٰ میں جو عظیم انقلاب برپا کیا تھا وہ اس دَور کے مخصوص چیلنج کا نہایت کامیاب جواب تھا۔ اب چونکہ چیلنج کی نوعیت اور اس کے تقاضے بدل گئے ہیں لہٰذا اسلامی تعلیمات کا وہ خزینہ اور اسلامی نظامِ حیات کا وہ ڈھانچہ جو ہمیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے رفقائے کار کے ذریعے ملا ہے، بالکل بیکار ہو کر رہ گیا ہے۔

دَورِ حاضر کی بے دین قیادت اور سیادت کی کامیابی کا سارا راز اس بات میں مضمر ہے کہ اُس نے غلط مفروضات پر قائم ہونے والے باطل نظریات کو ناقابلِ تردید حقائق کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور جدید ذہن کے اندر اِس خیال کی آبیاری کی ہے کہ حق وہی ہے جسے مغرب حق کہتا ہے اور جسے اہلِ مغرب کی بارگاہ میں حق ہونے کی سند نہیں ملتی وہ لازمی طور پر باطل ہے۔ آپ اگر مغرب کے پیش کردہ غلط مفروضات اور اُن پر قائم ہونے والے غلط افکار کا دِقّتِ نظر سے مطالعہ کریں تو آپ کو بحرِ اوقیانوس کے اندر چلنے والی گرم رَو اور اُس میں مچھلیوں کی خلافِ عقل حرکت کا لطیفہ یاد آ جائے گا۔ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ کسی من چلے نے یہ شوشہ چھوڑ دیا کہ بحرِ اوقیانوس میں جو گرم رَو چلتی

ہے اُس میں مچھلیاں لازمی طور پر مخالف سمت میں تیرنے لگتی ہیں۔ اب اِس غلط مفروضہ پر ریسرچ ہونے لگی اور اُسے ایک علمی بنیاد فراہم کرنے کے لیے مختلف قسم کے دلائل پیش کیے جانے لگے۔ ابھی یہ علمی کاوشیں اپنے زوروں پر تھیں کہ کسی حقیقت پسند آدمی نے سائنٹیفک ریسرچ کے اجارہ داروں سے یہ کہا کہ اِس موضوع پر محنت اور سرمایہ صرف کرنے سے پہلے خدارا یہ معلوم کرو کہ کیا یہ بات صحیح بھی ہے؟ چنانچہ جب سمندر میں اُتر کر جائزہ لیا گیا تو معلوم ہوا کہ مچھلیوں کے جس حیرت انگیز طرزِ عمل پر اتنی وسیع ریسرچ ہو رہی ہے اُس کی سرے سے کوئی حقیقت ہی نہیں۔

قریب قریب یہی حال دَورِ جدید کے اکثر و بیشتر نظریات کا ہے۔ حالات کے بالکل سطحی مشاہدہ اور جزوی مطالعہ سے غلط نظریات گھڑ لیے جاتے ہیں اور پھر اُن نظریات کو صحیح اور برحق ثابت کرنے کے لیے غلط مفروضات کا سہارا لیا جاتا ہے۔ آخر یہ کیونکر فرض کر لیا گیا ہے کہ سودی نظام کے بغیر کوئی معاشی نظام قائم نہیں ہوسکتا؟ دنیا میں کم و بیش سات سو سال تک مسلم ریاستوں کا معاشرتی نظام بڑی کامیابی کے ساتھ چلتا رہا۔ اگر وہ ریاستیں محدود وسائل کے ساتھ سود کے بغیر اپنے معاشی نظام کو چلا سکتی تھیں تو آج سود کے بغیر معاشی نظام کا تصور کیوں نہیں کیا جاسکتا۔ اِس موضوع پر جب افراد کو دعوتِ فکر دی جاتی ہے تو وہ یہ کہتے ہیں کہ دَورِ جدید کا نظامِ معیشت بڑا پیچیدہ ہے۔ کیا کسی نظام کی پیچیدگی اِس بات کی متقاضی ہے کہ اُس میں حرام کے اجزا بالضرور شامل ہوں۔ آج اگر کثیر پیداواری اور نو دپیداواری کے لیے سرمایہ کی وافر مقدار درکار ہے تو دُنیا میں ماضی کے مقابلے میں سرمایہ میں بھی تو غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔

اِس کے علاوہ اِس دعوٰی کی بھی آخر کیا بنیاد ہے کہ جب تک کسی ملک کے سارے وسائل حکومت کی تحویل میں نہ دے دیے جائیں اُس وقت تک اُس خطۂ ارضی میں اجتماعی عدل کا قیام ممکن نہیں۔ اِس ضمن میں یہ کیونکر فرض کر لیا گیا ہے کہ کسی قوم کے مترفین جب تک محدود وسائل کے مالک ہوں گے وہ ظالم اور سفاک ہوں گے اور جب ملک کے سارے وسائل پر اُن کا قبضہ ہو جائے گا تو وہ رحمدل اور انصاف کے پیکر بن کر ہر فرد اور ہر گروہ کو اُس کا جائز حصہ دلانے کی کوشش کریں گے؟ کیا اجتماعی عدل کی یہی ایک

صورت باقی رہ گئی ہے کہ لوگوں سے تقریر و تحریر کی آزادی سلب کر لی جائے، اُن کے ذہن رہن رکھ لیے جائیں، احساسات و جذبات کے لحاظ سے کسی معاشرے کو قبرستان اور سیاسی اعتبار سے اسے زندان بنا دیا جائے ؟ کیا ان ظالمانہ تدابیر کو اختیار کئے بغیر معاشی انصاف کے حصول کی کوئی دوسری صورت باقی نہیں رہی ؟

(بقیہ مکمل تعلیمی انقلاب کی منفرد آواز)

ان رائج رہے ہیں۔ پرانا مذہبی نظامِ تعلیم بھی ختم کیا جائے۔ اور یہ موجودہ نظامِ تعلیم بھی جو انگریز کی راہنمائی میں قائم ہوا تھا۔ ان دونوں کی جگہ ہمیں ایک نیا نظامِ تعلیم بنانا چاہیے جو ان کے نقائص سے پاک ہو اور ہماری اُن ضرورتوں کو پورا کر سکے جو ہمیں ایک مسلمان قوم اور ایک آزاد قوم اور ایک ترقی کی خواہشمند قوم کی حیثیت سے اس وقت لاحق ہیں[1]

انقلابِ تعلیم کا یہ پیغام دیتے ہوئے مولانا نے ایک سے زیادہ مقالات میں مطلوبہ اسلامی نظامِ تعلیم کا خاکہ اور اس کے اساسی اصول واضح کیے ہیں اور مزید تفاصیل کوئی دیکھنا چاہے تو اصل مقالات و مباحث میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ میرے لیے یہاں موقع کی مناسبت کے لحاظ سے مثبت بحث میں آگے جانا ممکن نہیں کیونکہ انتہائی طور پر کسی نظریہ و تصور یا کسی خاکے اور اس کے اصول و مقاصد کو سامنے لانے کے لیے بیان کو وسعت دیے بغیر چارہ نہیں۔ اور یہ اوراق ایسی وسعتِ بیان کے متحمل نہیں۔

---

[1] تعلیمات ص ۱۴۰ - ۱۴۱ -

مطبوعات ادارۂ ترجمان القرآن

★

نئی مطبوعات

★

	روپے
پارہ اول تفہیم القرآن	۶/۵۰
سورۃ الفاتحہ و البقرہ	۹/-
سورۂ یٰسٓ	۲/۲۵
سیرت کا پیغام	-/۵۰ روپے فی سینکڑہ
اسلام میں انسانی حقوق	-/۵۰ فی سینکڑہ

انگلش کتب

THE QUESTION OF DRESS
RS 2/50

FUNDAMENTALS OF ISLAM
SERIES BOOK 1
ESSENCE OF ISLAM
RS 7/00

SERIES BOOK 2
WORSHIP IN ISLAM
RS 5/-

نئے ایڈیشن

★

	روپے
دینیات	۶/-
حقوق الزوجین	۸/-
خلافت و ملوکیت	۱۸/-
حقیقتِ اسلام (خطبات حصہ اول)	۴/-
حقیقتِ صوم و صلوٰۃ 〃 دوم	۲/۵۰
حقیقتِ زکوٰۃ 〃 سوم	۲/-
حقیقتِ حج 〃 چہارم	۱/۷۵
حقیقتِ جہاد 〃 پنجم	۱/۲۵
سورۃ الحجرات	۲/۵۰
سورۃ الرحمٰن	۲/۲۵
سورۃ الفتح	۲/۲۵
سورۃ لقمان	۲/-

★